پیغام
seekho aur sikhao

پیغام حکایت

اسلام علیکم

پیغام کو بنے ہوئے آج ماشااللہ سے ۱۰ سال مکمل ہو چکے ہیں۔
پیغام نے ہمیشہ سے کوشش کی ہے کہ لوگوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ٹیلنٹ کو اُبھاریں، پیغام حکایت پیغام کے نثر نگاروں کی تحریروں پہ مشتمل ہے۔اُن تمام لکھاریوں کا شکریہ جن کی تحریریں پیغام حکایت کی زینت بنی ہیں۔ہمیں اُمید ہے آپ سب کو کتاب بہت پسند آئے گی، اور اس سے نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی، پیغام حکایت، پیغام کے ۱۰ سال پورے ہونے پہ پیغام ممبران کے لیئے ایک تحفہ ہے، ہمیں امید ہے آپ سب ایسے ہی پیغام کا ساتھ دیتے رہیں گے اور اس کی رونق بڑھاتے رہیں گے، اور پیغام ترقی کے منازل طے کرتا جائے گا۔ انشااللہ ۔ آمین ثمہ آمین

پیغام ایڈمن

آنچل

Index

S No	writer Name	subject
1	Naz	Khaja-Sara
2	Dr Maqsood Hasni	Hosla
3	Zarqa Mufti	Nayey saal ki pehli Duaa
4	Mahvish Afsar	Bhanwar say Sahil tuk
5	Masood	Aaj janat main kitni ronaq hai
6	Bhatakti Rooh (Rania)	Muqarara Waqt
7	Faisal Shabbir	Aghwa
8	Haya	Waqat
9	Syed Sushail Akhtar	Nazar
10	Price Tiger	Yeh Ishq nahi hai
11	Ismail Ijaaz Khayyal	Jama Tafreeq Zarab Taqseem
12	Faisal Sheikh	Haq Talfi
13	Farooq Saeed Qureshi	35 Puncture
14	Dr.Faustus	Behaq-i-Sarwar e Kainaat Rahmat al Alameen
15	Ibn e Niyaz	Her khawaish par dum niklye
16	Wasi Anjum	Akhri Alfaaz

انڈیکس

نمبر	لکھاری	عنوان
۱	ناز	خاجہ سرا
۲	ڈاکٹر مقصود حسنی	حوصلہ
۳	ذرقا مفتی	نئے سال کی پہلی دعا
۴	مہوش افسر	بھنور سے ساحل تک
۵	مسعود	آج جنت میں کتنی رونق ہے
۶	بھٹکتی روح رانیہ	مقررہ وقت
۷	فیصل شبیر	اغواہ
۸	حیا	وقت
۹	سید سہیل اختر	نظر
۱۰	پرنس ٹائیگر	یہ عشق نہیں ہے
۱۱	اسماعیل اعجاز خیال	جما تفریق ضرب تقسیم
۱۲	فیصل شیخ	حق تلفی
۱۳	فاروق سعید قریشی	پینتیس پنکچر
۱۴	ڈاکٹر فاسوٹس	بحق سرور کائنات رحمۃ العالمین
۱۵	ابنِ نیاز	ہر خواہش پر دم نکلے
۱۶	وصی انجم	آخری الفاظ

"_خواجہ سرا_"

آج کا میرا موضوع ہمارے معاشرے کا بہت حساس پہلو ہے۔ بچپن میں مجھے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ نہ جانے میں ان کو کیا سمجھتی تھی جو ایسا ہوتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ پتہ چلا کہ ان سے ڈرا نہیں جاتا بلکہ یہ تو محبت کے لائق ہیں۔ ہر کوئی تو ان کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کا کیا قصور؟ اگر وہ نہ عورتوں میں شمار ہیں نہ مردوں میں۔ اگر انسان کو خود کو بنانے کا موقع مل جائے تو میں گارنٹی کے ساتھ کہتی ہوں کہ ہر کوئی وہ ہی مٹی استعمال کرے گا۔ جس سے وہ بہت خوبصورت بنے۔ لیکن اگر خواجہ سرا ایسے ہیں تو بھلا ان کا قصور ہے۔ ہم تو اللہ پاک کی رضا میں ہمیشہ راضی رہنے والے امتی ہونے چاہیے تو پھر ہم ان خواجہ سرا کو کیوں اپنی زندگی کا حصہ نہیں بناتے؟ کیوں ان سے بھاگتے ہیں۔ کئی درجے بہتر ہیں وہ ہم سے کہ اللہ پاک کی اس رضا میں بھی اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور ہم ان کا ہی مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں قبول ہی نہیں کر پاتے۔ کیوں آخر کیوں ہم ایسا کرتے ہیں۔ اپنی کون سی خامی کا بدلہ ان کا مذاق اڑا کر نکالتے ہیں۔ بس ہاں شاید ہم مکمل مرد ہیں، شاید ہم مکمل عورت ہیں۔ اور وہ بیچارے جو نہ مرد ہیں نہ عورت ہیں۔ جنہیں ان کے گھر والے تک قبول نہیں کرتے۔ اگر خدانخواستہ کسی کے ہاں ایسا بچہ ہو جائے تو کیا اگر اسکی تربیت گھر میں رکھ کر عام بچوں جیسی کی جائے تو کیا وہ باہر جا کر پھر ناچ گانا کرے گے؟ کیا وہ کسی کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلائے گے؟ نہیں ان کا بھی دل ہے۔ ان کے بھی جذبات ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسے بولے، انکی زندگی کا حصہ بنے، نہ کہ ان کے لئے گالی بنے۔

دوستوں ہمیں اپنے آپ سے پہل کرنی چاہیے، ان کی عزت کرنی چاہیے، ہم کون ہوتے ہیں کسی کا مذاق اڑانے والے، کسی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے والے۔ ایسا کر کے ہم اللہ پاک کی نظروں میں ہی گرتے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک خواجہ سرا کو یہ کہتے سنا کہ ''کاش ہر گھر میں ایک ایسا بچہ ہوتا کہ سب کو اندازہ ہو کہ ہم پر کیا بیتی ہے، تاکہ سب ان کو بھی معاشرے کا حصہ سمجھیں'' اب آپ خود سمجھ دار ہیں کہ انہوں نے کتنی بڑی بات کہی ہے۔ انسان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے تب ہی وہ ایسی بات کرتا ہے۔

خدارہ انہیں قبول کر لیجئے، انکی عزت کیجئے اور معاشرے میں ہر جگہ انہیں شامل کیجیے وہ بھی مسلمان ہی ہیں۔ ان کے ساتھ کافروں والا سلوک مت کیجیے۔ ہمیں تو کافروں کے ساتھ بھی برا سلوک کرنے کو نہیں کہا گیا تو کیوں ہم اپنے ہی مذہب کے لوگوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔

میرا پیغام بس یہی ہے کہ انہیں بھی قبول کر لیجیے۔ یہ بھی ہمارے ہی اپنے ہیں۔ ہمارے جیسا ہی انکا بھی دل ہے۔ جو دھڑکتا بھی ہے، جس میں درد بھی ہوتا ہے، انکو اپنی نظروں میں حقیر مت کیجیے۔ اگر خدانخواستہ اللہ رب العزت نے آپ کو حقیر کر دیا تو اس وقت پچھتاوے کو سوا کچھ پاس نہ ہوگا۔

اللہ پاک ہم سب کو اچھے اعمال کرنے کی اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین ثمہ آمین)

ناز

"حوصلہ"

کریم بخش نے چالیس برس محنت مزدوری کی۔ بیوی بچوں کا مخلص ساتھ نبھایا۔ کہیں سے شرینی بھنڈارا ملتا' تو وہ اسے بھی بڑی دیانت سے' گھر لے آتا۔ اس میں سے' رائی بھر اپنے منہ میں نہ ڈالتا۔ اس کی کوشش رہی کہ ہر ممکنہ خوشی' اپنے بیوی بچوں کو فراہم کرے۔ یہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے' کہ کوشش کے باوجود انہیں آسودہ' خوش حال اور بڑے لوگوں کی سی' سہولیات میسر نہ کر سکا۔

سکا ان پڑھ تھا۔ بچپن میں ہی والدین چل بسے تھے۔ لوگوں کے دروازے پر رل خل کر بڑا ہوا۔ ماموں نے' محنتی اور مشقتی دیکھتے ہوئے' رشتہ دے دیا۔ یہ بھی بہت بڑی بات تھی' ورنہ اس سے لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔ اللہ نے کرم فرمایا اور تین بیٹوں اور ایک چاندسی بیٹی سے نوازا۔ اس نے چاروں پر' برابر کی محبت اور مشقت نچھاور کی۔ بلاشبہ یہ اس کا فرض اور بچوں کا حق تھا۔ اب وہ بوڑھا' کم زور اور بیمار ہو چکا تھا۔ بچے جوان ہو چکے تھے۔ اسے ان کی توجہ کی ضرورت تھی۔ اسے اس کے اپنے ہی گھر میں' اس کے ان اپنوں میں سے' کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس کی بیوی سعیدہ اسے سارا دن کوسنے دیتی رہتی تھی۔ شام کو تینوں بیٹے کوئی نا کوئی جلی کٹی سنا دیتے۔ ہاں مقبولاں' اس کی بیٹی' اس سے ہم دردی رکھتی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں' اسے بھی رگڑا مل جاتا' حالاں کہ وہ سب کی خدمت کرتی تھی۔ سگے بھائیوں کی کٹھور دلی پر' سسک پڑتی اور بھلا کر بھی کیا سکتی تھی۔

دونوں باپ بیٹی' گلی کے کتے سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ اس دن تو تینوں بیٹوں اور سعیدہ نے حد ہی کر دی۔ مقبولاں نے کہا' اباتم کہیں منہ کر جاؤ' تمہارے لیے اس گھر میں گنجائش نہیں رہی۔ کریم بخش کو بیٹی کی بے چینی اور پریشانی نے' ساری رات سونے نہ دیا۔ اس نے سوچا' کاش وہ مر ہی گیا ہوتا۔ اس نے کوچ کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر سورج چڑھنے سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا۔

اب اس کے حوصلے نے' یکسر جواب دے دیا تھا۔ اس سے زیادہ' برداشت کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ دکھ' افسوس اور پریشانی سے وہ نڈھال ہو گیا تھا۔

وہ ان کے لیے جیا تھا۔ اسے ہر لمحہ' ان کی بھوک پیاس کی فکر لگی رہتی تھی۔ آج جب وہ بوڑھا ہو گیا تھا' اس اکیلے کے' دو لقمے ان پر بھاری ہو گیے تھے۔ بیٹی بے چاری' اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو خود' زر خرید غلاموں کی سی زندگی کر رہی تھی۔ کسی دربار پر' اسے اس سے کہیں بہتر' روٹی مل سکتی تھی۔ ایسے باوارث لاوارثوں کے لیے' صوفیا کرام کے دربار' کہیں بہتر ٹھکانہ ثابت ہوتے ہیں۔

حاجی صاحب کے پاس' اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ دوست عزیز اور رشتہ داروں کی بھی کمی نہ تھی۔ ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ گھر میں ایک چھوڑ' دو بیویاں تھیں۔ نوکر چاکر' خدمت کے لیے موجود تھے۔ کامیاں اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ان سب کے ہوتے' وہ زندگی کو ادھورا اور کھوکھلا محسوس کرتے تھے۔ یہ سب کچھ' ان کے لیے بے معنی اور لایعنی تھا۔ یہ اپنے ان کے لیے غیر تھے۔ اکثر کہتے آج آنکھ بند کرتا ہوں' تو یہ سب غیروں کا ہوگا۔ بے اولاد ہونے سے بڑھ کر' کوئی اور دکھ ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی نے مشورہ دیا' حاجی صاحب کسی گریب سے' بیٹا یا بیٹی گود کیوں نہیں لے لیتے۔ مشورہ معقول تھا۔ انہوں نے بڑا غور کیا۔ پھر فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی بچے کو گود ہی لے لیتے ہیں۔

سجاد آج بہت غمگین سا تھا۔ خاور نے پوچھا' یار اتنے پریشان سے کیوں ہو۔ اس نے اداس لہجے میں کہا' یار پہلے ہی اللہ نے تین بیٹیاں دے رکھی ہیں' آج رات کو چوتھی بھی ٹپک پڑی ہے۔ سوچا تھا' اس بار اللہ بیٹا دے دے گا' مگر ہم گریبوں کی اتنی اچھی قسمت کہاں۔ سجاد نے سمجھایا کہ فکر نہ کرو' ہر کوئی اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے۔ اس نے جواباً کہا' قسمت کیا ساتھ لانی ہے' مزید بوجھ پڑنا تھا' وہ پڑ گیا ہے۔ کس بوتے پر دل کو تسلی دوں۔

خاور حاجی صاحب کے ہاں ملازم تھا۔ اس نے حاجی صاحب کو سجاد کی پریشانی کے متعلق بتایا۔ حاجی صاحب نے' سجاد کی نومولود بچی کو گود لینے کی ٹھان لی۔ پھر وہ خود' بڑی بیگم صاحب کو ساتھ لے کر سجاد کے گھر چلے آئے۔ خاور کو انہوں نے وہاں آ جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ سجاد کو حیرانی کے دورے پڑ رہے تھے۔ گویا چونٹی کے گھر' از خود بن بلائے نرائن چلے آئے تھے۔ حاجی صاحب نے آج تک دیا ہی تھا' کبھی کسی سے کچھ مانگا نہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے' کہ بات کس طرح سے کریں۔ خاور نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ سجاد نے خوشی خوشی بچی حاجی صاحب

کی گود میں ڈال دی۔ ننھی سی جان کو گود میں دیکھ کر، حاجی صاحب مسرور ہو گیے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

حاجی صاحب نے سجاد کو رنگ دیا۔ سجاد کے لیے یہ بچی لکشمی دیوی ثابت ہوئی۔ انہوں نے کسی دور دراز علاقہ میں، اسے اس کے نام سے، مکان خرید دیا۔ ساتھ میں، اسے ایک کاروبار بھی شروع کرا دیا۔ سجاد دنوں میں، علاقہ کا معزز شہری بن گیا۔ پہلے وہ علاقہ کے معزز شہریوں کو سلام کہتا تھا، اب لوگ اسے سلام بولاتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وقت کی کروٹ سے، کب کوئی آگاہ ہو سکا ہے۔ کب کیا ہو جائے، آج تک کسی پر نہیں کھل سکا۔

وقت پر لگا کر محو سفر رہا۔ بچی، جس کا نام راحیلہ رکھا گیا تھا، لاڈ پیار اور ان گنت آسائشوں میں بڑی ہوئی۔ اچھی درس گاہوں میں پڑھی۔ حاجی صاحب بوڑھے ہو گیے تھے۔ انہیں راحیلہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ رشتے تو بہت آتے تھے، لیکن ان کی پسند کا معیار بالکل مختلف تھا۔ انہیں لاڈوں پلی راحیلہ کے لیے، شاید کوئی فوق الفرت خوبیوں کا حامل لڑکا درکار تھا۔ پھر ایک دن، بلند حوصلہ کے مالک حاجی صاحب کے مرنے کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ ان کی موت، دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ راحیلہ بگو حجام کے لڑکے، قادر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ حاجی صاحب یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔

بڑی بیگم صاحب، اس صدمے سے ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے، چند لمحوں میں، کچھ کا کچھ ہو گیا۔ جو ہوا، کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اتنے بڑے جگرے کے مالک بے وجود ہو چکے تھے۔ وہ اپنی اصل میں، ان کی کچھ بھی نہ تھی۔ انہوں نے اسے محض پالا پوسا تھا۔ اس کے باوجود، وہ ان کا سب کچھ ہو گئی تھی۔

نذیراں ان پڑھ، بے سلیقہ اور کچن کے امور میں بالکل کوری اور پیدل تھی۔ خوب صورت ہونے کی غلط فہمی، ہمیشہ اس کے سر پر، سوار رہتی۔ خاوند کے رشتہ دار، اسے کبھی ایک آنکھ بھی نہ بھائے تھے۔ اس پہ طرہ یہ کہ زبان اور کردار بھی، صفائی ستھرائی سے بالاتر تھے۔ ایک روایت کے مطابق ایک جگہ سے، دوسری روایت کے مطابق دو جگہوں سے، اسے ان چار خوبیوں کی بنا پر، طلاق ہو چکی تھی۔ اس کی ان خوبیوں کے باعث، ہر کوئی رشتہ کے حوالہ سے، ان کے گھر کے قریب سے بھی گزرنے سے ڈرتا

تھا۔ اس کا باپ امام مسجد تھا' اس ناتے لالچ' ہوس' آنکھ کی بھوک اور ناشکری گھٹی میں میسر آئی تھی۔ آوارہ فکری' ماں کی طرف سے دودھ میں ملی تھی۔

منظور صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی کی یک پسری پر' ہر وقت پریشانی رہتی۔ وہ چاہتے تھے' چلو زیادہ نہیں' جوڑی تو ہو جائے۔ رضی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ تھی۔ رشتے تو بہت تھے' لیکن صفدر عقد ثانی کے رپھڑ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ موجود پر قانع تھا۔ آخر منظور صاحب نے' بھائی کو قائل کر ہی لیا۔ بہت سے رشتوں میں سے' کسی کے کہنے پر' نذیراں کو اس لیے پسند کر لیا گیا' کہ ٹھکرائی ہوئی ہے' غریب اور دیہاتی ہے' خدمت کرے گی' ساتھ میں اللہ اولاد بھی عطا فرما دے گا۔

نذیراں کو کوئی زنانہ مرض لاحق تھا' جس کا علاج کروایا گیا۔ اللہ نے' منظور صاحب کو ایک بھتیجے سے نوازا۔ اللہ کے اس احسان پر' سب خوش ہوئے۔ دوسری طرف یہ بھی کھلی حقیقت تھی' کہ پوتڑوں کے بگڑے کم ہی سنورتے ہیں۔ بیٹا پیدا ہو جانے کے باعث' نذیراں کا ڈنگ اور بھی تیز ہو گیا۔ صفدر نے دوسری سے تیسری بار پانی مانگ لیا' تو کہتی مجھ سے یہ سیاپا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہہ دیتی: مرتا ہے نہ جان چھوڑتا ہے۔ جب بولتی' قیامت ہی توڑ دیتی۔ صفدر کا چہرا دیکھتے ہی' جانے اسے کیا ہو جاتا' بلاوجہ اور بغیر کسی بات کے لڑنا شروع دیتی۔ حرامدہ' کنجر' سکھ' کافر' بے بنیادا وغیرہ ایسے کلمات' کہہ جاتی۔ صفدر ننھی سی جان کو دیکھ کر' برداشت کر جاتا۔

بھائی کے اس ناہنجار تخفے پر' سسک کر رہ جاتا۔ اس نے نذیراں کے سامنے ہاتھ جوڑے' پاؤں پڑا' اپنے سر پر جوتے مارے اور کہا' اگر میں برا ہوں تو تم ہی اچھی بن کر دکھا دو' مگر کہاں۔ صفدر کا اصل قصور' شریف اور پڑھا لکھا ہونا تھا۔ اگر کبھی بیمار پڑ جاتا' خدمت تو دور کی بات' کہتی' جاؤ یہاں سے میرے سر نہ چڑھنا۔

بے پوچھے، گھر سے چلے جانا اور دیر تک باہر رہنا، سب سے زیادہ تکلیف دہ حرکت تھی۔ گھر لوٹنے کے بعد، صفدر کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی، بکواس کرنا شروع کر دیتی۔ مت مار کر رکھ دیتی۔ ایک بار، صفدر نے اپنے سسر کو بلایا اور اس کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر کہا، خدا کے لیے اس کو ساتھ لے جاؤ اور اس کو سمجھاؤ۔ تین چار دن بعد، ڈنگ مزید تیز کر کے واپس آ گئی۔ آخر وہ امام مسجد تھا، تفرقہ نہیں ڈالے گا، تو کھائے گا کہاں سے۔ صفدر ابھی تک پاگل نہیں ہوا تھا۔ مرا بھی نہ تھا۔ پہاڑ حوصلے کا مالک ہو کر بھی، عارضہء قلب کا شکار ہو گیا۔

عزازئیل اپنے سے برتر سے منحرف ہوا، کیوں کہ اس کے ظرف کی وسعت ہی اتنی تھی۔ معافی کی طرف نہ آیا، بلکہ منفی رستوں پر چل پڑا۔ آدم کو برتر تسلیم کرنا، اس کے حوصلے سے باہر تھا۔ وہ اللہ کے ظرف سے آگے کیسے نکل سکتا تھا۔ مخلوق اور خالق کے ظرف کا انتر، اس سے باخوبی ہو سکتا ہے۔

نمرود اپنے وجود سے باہر ہوا، خدا تو بہت آگے کا معاملہ ہے، وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برتری تسلیم کرنے کے لیے، تیار نہ تھا۔ کسی کو، خود سے برتر تسلیم کرنے کے لیے بھی، حوصلہ درکار ہوتا ہے، کہاں سے لاتا اور پھر اپنی ہی کرنی میں پکڑا گیا۔ چار سو سال، چھترافشانی برداشت کرتا رہا۔ عبرت پکڑ کر، توبہ کے دروازے پر نہ آیا۔

یہ ہی معاملہ، فرعون کے ساتھ درپیش تھا۔ تھوڑ ظرفی، تکبر اور غصہ نے، اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ تب ہی تو، دریا میں گھوڑے ڈال دیے۔ حواس باقی ہوتے، تو یہ غلطی نہ کرتا۔

قارون کے پاس وافر لقمے تھے۔ ان میں سے چند ایک لقمے دے دینے سے کچھ فرق نہیں پڑنا تھا۔ اتنا حوصلہ لاتا کہاں سے، تھا ہی نہیں۔ اللہ تو ماننے اور نہ ماننے والوں کو بھی دیتا ہے۔ مقررہ سے، ایک سانس بھی، منہا نہیں کرتا۔

کوئی کتنا بھی حوصلے والا کیوں نہ ہو، دکھ کے میدان میں، قدم چھوڑ دیتا ہے۔ مخلوق کا حوصلہ، بموجب ظرف حدود میں رہتا ہے۔ حوصلہ جب مجوزہ حدود سے باہر قدم رکھتا ہے، تو کٹا یا دیمک زدہ برگد بھی زمین بوس ہو جاتا ہے۔ انسان اور خدا میں، یہ ہی فرق ہے، کہ وہ ہر حالت اور ہر صورت میں، قائم بذات رہتا ہے۔ ساری مخلوق اس کی تخلیق ہے، اور ایسی ان حد مخلوقات بیک جنبش، تخلیق کرنے پر قادر ہے۔ ایسا ان حد مرتبہ کرے، تو بھی کچھ اس کے ظرف سے باہر نہ ہو گا۔ مخلوق اور خدا کی ذات گرامی میں، یہ ہی بنیادی فرق ہے۔ کوئی کتنا بھی بڑا ہو جائے، ان حد حوصلے اور ظرف کا مالک نہیں ہو پاتا۔ منفی کے رد عمل میں، کچھ بھی ہو سکتا ہے، یا کر سکتا ہے۔ مجبوری اور بے بسی کی حالت میں، اسی کی طرف پھرتا ہے۔ متکبر لوگوں کو، اپنی کھال میں رہنا چاہیے، ورنہ ان کی اپنی ہی بدحوسی کی لاٹھی، انہیں برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ لوگ اسے قسمت کے کھیل کا نام دیتے ہیں، حالاں کہ یہ قسمت کا کھیل نہیں ہوتا، وہ تو اپنے کیے کا پھل، اپنے ہی ہاتھوں سے پا رہے ہوتے ہیں۔

یہ کہانی کار خدا بخش، جو کسی زمانے میں، ڈیرے کی جان ہوا کرتا تھا، کی آخری کہانی تھی۔ اس کے بعد اسے، چودھری کے ڈیرے پر آنا نصیب نہ ہوا۔ صفدر کی کہانی تک، سب کچھ گوارہ تھا، اس کے بعد کی کتھا میں، اگرچہ چودھری صاحب کا ذکر تک نہ تھا، لیکن یہ سب کچھ اس نے، چودھری صاحب کی طرف منہ کر کے کہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے، نفرت اور بغاوت کی زہریلی شعاعیں نکل رہیں تھیں۔

ڈاکٹر مقصود حسنی

نئے سال کی پہلی دعا

اکتیس دسمبر کی رات کا آخری پہر ہے۔ ایک پُرآسائش تاریک کمرے میں آرام دہ صوفے پر ایک ہیولا سا بیٹھا ہے۔ وہ بار بار پہلو بدلتا ہے۔کبھی دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام لیتا ہے اور کبھی بے چینی سے پیر پٹخنے لگتا ہے۔اُس کا عالیشان گھر، گاڑیاں

خوبصورت بیوی خوبصورت صحت مند ذہین بچے سب اُس کی کامیابی کے گواہ ہیں۔خاندان میں بڑے چھوٹے سب اُس کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔معاشرے میں اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔مگر ایک خالی پن ہے جو اُس کی روح میں بھرتا جارہا ہے۔نہ جانے ایسا کیا ہے جو اُسے حاصل نہیں ہے۔

وہ سوچتا ہے کہ اگر اگلے ہی لمحے وہ یہاں نہ رہے تو کیا فرق پڑے گا۔

اس کے بیوی بچے کچھ دن غمگین رہیں گئے پھر اپنی اپنی مصروفیات میں گم ہوجائیں گئے۔

کسی کو کیا فرق پڑے گا۔

آج اُسے اپنا وجود بہت کم مایہ محسوس ہورہا تھا۔

اتنی بڑی دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو اُس سے زیادہ کامیاب ہیں زیادہ اونچے مقام اور رُتبے کے حامل ہیں۔

پھر اس دنیا میں اگر نہ رہے تو کیا فرق پڑے گا۔

شائد کل کے اخبار میں چار سطروں کی خبر چھپ جائے کہ معروف بزنس مین۔۔۔۔۔انتقال کرگئے مرحوم

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کمپنیوں کے مالک تھے اُن کے پسماندگان

میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شامل ہیں اُن کا

جنازہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اُٹھایا جائے گا۔

پھر وہی شب و روز ہوں گئے شہر کی گہما گہمی میں کیا کمی آئی گئی۔

سورج ،چاند،ستارے سب اپنے اپنے مدار میں اپنے نظام الاوقات کے مطابق گردش کرتے رہیں گے۔

اب اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ با آواز بلند سوچنے لگا

اے میرے رب تو نے مجھے کس لئے پیدا کیا؟

میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اے میرے رب مجھے ہر دُنیاوی آسائش حاصل ہے۔

اگر میں سچ بولوں تو مجھے جنت کی خواہش نہیں۔

دُنیا میرے لئے جنت سے کیا کم ہے؟

تو پھر یہ میرے اندر کا خلا کیوں بڑھتا جا رہا ہے؟

جیسے میری روح کو گھن لگ گیا ہے

آہستہ آہستہ میرے اطمینان میرے سکون قلب کو ختم کر رہا ہے

میرا اعتماد کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے

نہ جانے میں یہاں موجود ہوں یا یہ سب طلسم ہے

میری آنکھ کھلے گی تو نہ یہ عالیشان مکان ہوگا نہ یہ چاہنے والے نہ یہ مقام نہ رُتبہ

تو پھر مجھے اور کیا چاہئے

مجھے جینے کی اک وجہ چاہئے

جو میرے خالی وجود کو بھر دے

جو اپنی ذات پر میرے اعتماد کو بحال کر دے

اے میرے رب میری زندگی کو مقصد دے دے

زرّ قا مفتی

"بھنور سے ساحل تک"

وہ درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔۔۔ٹانگ کا پھوڑا پھٹ گیا تھا۔۔۔اور خون اور مواد کی لکیر نیچے جاتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔۔۔وہ سخت پریشان تھا۔۔۔پیپر شروع ہوئے ابھی ایک گھنٹہ گزرا تھا وہ کھڑا ہوگیا۔۔ممتحن کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ممتحن نے چپڑاسی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔۔۔وہ تیزی سے بیت الخلا میں داخل ہوا اپنے کرتے کا دامن پھاڑ کر مواد کو صاف کیا اور اس دامن کے بچے ہوئے ٹکڑے کو پٹی کی صورت میں لپیٹ لیا۔۔۔

تقریباً بھاگتا ہوا امتحان ہال کی جانب بڑھا۔۔۔ممتحن سے اندر آنے کی اجازت طلب کی کئی نظریں بیک وقت اسکے سراپے پر اٹھیں کچھ میں رحم تھا اور کئی نظروں میں تمسخر تھا۔۔۔وہ سب سے بے نیاز ڈیسک کی طرف بڑھا وہ چودھری رب نواز کا بیٹا تھا جسے ماں کی بے وقت موت اور چودھری رب نواز کی دوسری شادی نے در بدر کر دیا تھا۔۔۔چودھری صاحب کے مرتے ہی اکبر نواز اور اسکی بہن کے لیے دنیا اندھیری ہوگئی اسے سوتیلی ماں، بہن بھائی اور ماموں نے گھر سے باہر نکال دیا۔۔۔

باپ موجود تھا تو زمانے کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر سائبان تو تھا۔۔۔ ماں تو بابا کے زمانے ہی میں ظلم کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔۔۔اکبر نواز کو اچھی طرح یاد تھا اپنے بچپن کا دور جب وہ اور بابا ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے تو اسکے سالن میں ماں مرچیں زیادہ ڈال دیتی آنکھوں سے آنسو بہتے تو ماں بہانے باز اور چلتر کے القابات سے نوازتی۔۔خدا جانے رب نواز کو کبھی یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ بیٹے کے کھانے میں سے ایک نوالہ ہی چکھ لیتا۔۔۔بہن کے ساتھ بھی ماں ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔۔۔

بابا کے مرنے کے بعد دونوں بہن بھائی پریشان تھے سوتیلی ماں نے دونوں کو گھر سے نکال دیا تھا۔۔۔ اکبر نواز پریشان تھا کہ وہ اپنی بہن کو لے کر کہاں جائے بے درد زمانے کی میلی آنکھ سے کیسے بہن کو بچائے۔۔۔ بابا کی زمینوں اور ہاریوں کے گھروں کے پاس سہمے ہوئے بکری کے بچے کی طرح۔۔۔۔۔۔ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔۔۔ اکبر نواز نے ٹھیکے کا کام لے لیا دن بھر اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے۔۔۔ مزدوری کیا کرتا تھا۔۔۔ بہن دوسروں کے گھر جا کر جھاڑو پوچھا کیا کرتی اور آنکھوں میں آئی نمی اپنے دوپٹے کے کونے سے پوچھتی رہتی۔۔۔ اکبر نواز کی ماں کا خواب کہ اس کے بچے پڑھ لکھ کر ایک اچھے شہری بنیں اکبر نواز اور اسکی بہن کی آنکھ میں پھول کی مانند مرجھا رہا تھا۔۔۔ خوشیوں کے سارے منظر دھندلا رہے تھے۔۔۔ پھر ایک دن امید کی کرن بن کر غلام محمد جو کہ ان بچوں کی سوتیلی ماں کا خاص نوکر تھا۔۔۔۔ دونوں کو اپنے گھر لے گیا۔۔ بیوی سے کہا کہ مجھے انکی ماں اور ماما سے کوئی خوف نہیں آج کے بعد یہ بچے یہاں رہیں گے۔۔۔

غلام محمد نے اکبر نواز سے کہا کہ وہ یہاں رہ کر اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔۔۔ اکبر نواز کی آنکھیں تشکر سے نم ہو گئیں۔۔۔ اکبر نواز کو آج اندازہ ہو گیا کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اسکا اللہ ہوتا ہے۔۔۔ آٹھویں جماعت تو اس نے بابا کے سامنے پڑھ لی تھی۔۔۔ اگرچہ ایک سال کے بعد اس نے اپنی پڑھائی کا آغاز کیا چونکہ اکبر نواز ذہین تھا اس لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔۔۔ غلام محمد کے ساتھ وہ کھیت پر کام بھی کرتا، مزدوری بھی کیا کرتا تھا اور رات میں سڑک کے کنارے لگی سرکاری روشنی میں پڑھائی کیا کرتا تھا۔۔۔

غلام محمد نے ڈاکخانے کے بابو سے بات کر کے فیس جمع کرا دی تھی۔۔ اور ڈاکخانے والے بابو نے ہی اس کے لیے اپنے ایک دوست کے وساطت سے کتابوں کا بھی انتظام کر دیا تھا۔۔۔ ماں بھی رات خواب میں آ کر کہتی کہ اکبر پتر تو بڑا بانکا اور محنتی پتر ہے۔۔۔۔۔۔ پتر خوب پڑھ اور میرا خواب پورا کر۔۔۔

وہ محنت کا ایک جذبہ لے کر اُٹھتا۔۔۔اب تو امتحان شروع ہو گئے تھے۔۔۔آج اسکا پیپر تھا۔۔۔لیکن قدرت کو بھی اسکا امتحان شاید اور لینا تھا کہ اسکی ٹانگ پر سریا لگنے سے پھوڑا ہو گیا تھا۔۔مشکلیں انسان کے عزم کو پختہ اور بلند کرتی ہیں۔۔۔رکاوٹیں انسان کے جذبے کو اور تند دیتی ہیں۔۔۔

یہ ہی کچھ اکبر نواز کے ساتھ ہوا تھا۔۔۔حوصلہ بڑھتا رہا۔۔۔آج تو پھوڑا پھٹنے کے بعد چین آ گیا تھا۔۔اکبر نواز نے باقی پرچہ مکمل کیا اور اب تکلیف کی کمی نے اسے بھوک کا احساس دلایا۔۔اس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا ایک مڑا تڑا نوٹ ۵ روپے کا نکلا اس نے ڈیڑھ روپے کے چنے خریدے اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا ابھی اکبر نواز کے چار پیپر باقی تھے۔۔۔امتحان سے واپسی پر مزدوری کرتا شام کو گھر پہنچتا تو بہن آنکھوں میں خوشگوار مستقبل کے خواب سینے میں سجائے اپنے ویر کو خوش آمدید کہتی وہ رات گئے تک پڑھائی کرتا رہتا گلی کے کتے بھونک بھونک کر جاگنے میں اکبر نواز کا ساتھ دیتے آخر امتحان ایک ایک کر کے گزر گئے۔۔۔۔

آج صبح کچھ نئے انداز میں طلوع ہوئی آج کا سورج اکبر نواز کے لیے ایک نئے مستقبل کا پیغام لے کر آیا۔۔۔اکبر نواز کا آج میٹرک کا نتیجہ آیا۔۔۔

اس نے پورے ضلع میں پوزیشن لے کر اپنی ماں کا خواب کو پورا کیا اور یقینا آج اکبر نواز کی ماں کی روح بہت خوش ہو گی۔۔۔بہن بھائی خوشی کے آنسو لئے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔۔۔اور آج اکبر نواز کی سوتیلی ماں نے مٹھائی منگا کر پورے گاؤں میں بانٹی کہ آج میرا پتر دسویں جماعت میں اول آیا ہے۔۔۔

مہ وش افسر

”آج جنت میں کتنی رونق ہوگی“

آج جنت میں کتنی رونق ہوگی

جنت کے ہر دروازے پر جنت کے باسی قطار در قطار خوشی و طرب کی حمد و ثنا کرتے ہوئے استقبال میں لگے ہوں گے۔ ایک معتبر و بزرگ فرشتے نے مسکراتے ہوئے کہا ہوگا:

وہ دیکھو! وہ عظیم ماں آرہی ہے جسے بھاگ جانے کا موقع دیا گیا، مگر اس نے آگ میں جل جانا پسند کیا، مگر اپنی جان بچا کر نہیں بھاگی۔ آج میں اس ماں کو جنت کی سردار خواتین کے سامنے لے جاؤں گا اور کہوں گا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی، اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی میں تمہاری خدمت میں ایک ایسی ماں لایا ہوں جس نے دنیا میں ایک ٹیچر ہونے کا، ایک ماں ہونے کا حق ادا کر دیا ہے، وہ اٹھیں گی اور اس ماں کے ماتھے پر بوسہ لیں گی، کیا شان ہے اس ماں کی، یہ میرا اعزاز ہے کہ میں اسکی خدمت بجا لاؤں گا

ایک دوسرے فرشتے نے کہا ہوگا:

وہ دیکھو! ننھی ننھی پیاری پیاری بچیاں آرہی ہیں۔ انہیں ہم جنت میں شہزادیوں کی طرح رکھیں گے

ایک حسین حور بولے گی:

وہ دیکھو، وہ پیارے پیارے بچے آرہے ہیں۔ وہ جو جنت میں قاسم اور طاہر کے ساتھ کھیلیں گے، حسن اور حسین کی صف میں کھڑے ہوں گے۔ یہ میرے پیارے ہیں، مجھے اللہ تعالیٰ نے ان کی دلجوئی کے لیے چنا ہے

ایک دوسری حور بولے گی:

وہ معصوم سا پیارا سا ننھا سا بچہ جس نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی ہے، جس کا چہرہ کسی فرشتے کی طرح ہے وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی ماں اسکے لیے آہ و کرب میں ڈوبی ہوگی، مگر میں اسے پا کر خود کو سب سے خوش قسمت سمجھوں گی، وہ بچہ مجھے اللہ نے عطا کیا ہے

آج کنٹرمیں کتنی رونق ہوگی

فضل للہ اور اسکے ساتھی اپنے اپنے بلوں میں گھس کر شکرانے کے نفل ادا کر رہے ہوں گے کہ انہیں دنیا سے کافر و مرتد مسلمانوں کی ایک نسل کو ختم کرنے کا موقع ملا ہے۔انہیں فخر ہوگا کہ ان کے وہ سات ساتھی جو اس اہم مہم پر گئے تھے، وہ آج سرخرو ہو گئے ہیں، یہ سچے مسلمان ہیں۔ یہی لوگ اسلام کو صحیح سمجھتے تھے، آج انہوں نے بھی اپنا نام شہیدوں میں لکھوالیا ہے۔آج وہ بھی جنت میں ستر ستر حوروں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے ہوں گے۔آج ان کے مولوی خدا کے حضور بسجدہ ہونگے کہ انہوں نے ان لوگوں کی جو ذہنی پرورش کی، وہ رنگ لائی۔۔۔

آج رائے ونڈ میں کتنی رونق ہوگی

نواز شریف کے کندھوں پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا! 126 دِن سے دھرنے کا جو پستول اسکی کنپٹی پر تھا، وہ خود بخود ہٹ گیا! جس دھرنے کو روکنے کے لیے گلو بٹ چھوڑے گئے، فائرنگیں ہوئیں، پولیس کی دھشتگردی کرائی گئی، پارلیمنٹ میں آرمی کو جھوٹا کہا گیا اور جن پر الزامات لگائے گئے، سچ دکھانے پر ٹی وی چینلز بند کئے گئے، واہگہ پر انسان کے خون سے ہولی کھیلی گئی، ماڈل ٹاؤن میں قتل کرائے گئے، حاملہ عورتوں پر گولیاں چلوائی گئیں، بزرگ لوگوں کو گھسیٹا گیا، اندھوں پر تشدد کیا گیا۔۔۔ آج رائے ونڈ میں کتنی رونق ہو گی۔ خواجہ سعد کی بے لگام زبان، رانا ثنا اللہ کی بدمعاشیاں، پرویز رشید کے جھوٹ، خواجہ آصف کا اسی آرمی کے خلاف زہر اگلنا، جس کی نسبت عہدے پر وہ فائز ہے۔۔آج رائے ونڈ میں کتنی رونق ہوگی کہ جس آرمی کے خلاف ایک مدت سے زہر اگل رہے ہیں، جس آرمی کو کھوکھلا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے وہ آرمی جو پاکستان کے اتحاد کا واحد ذریعہ ہے اسے اور بم کو جس نے ان کے نظام کر ہلا کر رکھ دیا، وہ بم جو ایسی ٹک ٹک ٹک کر رہا تھا گویا اب وہ ایسا پھٹے گا کہ گونواز گو ہو کر ہی رہے گا۔۔خود بخود ٹھس ہو گیا، آرمی نے جو غداری 1998 میں کی تھی، اسکا بہت عمدہ بدلہ چکا دیا- ایک تیر میں دو شکار- اسے کہتے ہیں ایک بال پر دو وکٹ گرانا۔۔آج تو سچ مچ میں رائے ونڈ میں بڑی رونق ہوگی۔۔۔

تین دن کرب میں رہنے کے بعد آج جب ہوش آیا اور حالات کا جائزہ لینا شروع کیا تو بہت سارے سوال ذہن میں جنم لینے لگے۔

رات بھر میں دہشت گردوں کو پھانسی دینے کی فرداد منظور! اگلے چند ہی گھنٹوں میں ان پر عمل۔۔۔ ہماری قوم کو اس عمل پر حکومت کا شکرگزار ہونا۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟

کیا ہماری قوم سمجھتی ہے کہ پھانسی دینے سے دہشت گردی پر قابو پا لیا جائے گا؟ وہ دہشت گرد جو اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر خود کو اڑا دیتے ہیں، کیا انہیں پھانسی کا خوف ہوگا؟!! یا کیا ان کے پھانسی دیئے جانے سے ان کے دوسرے ساتھیوں پر خوف طاری ہو جائے گا؟ اور وہ حکومت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جائے گے؟ وہ لوگ جو خود کو بم سے اڑا دیتے ہیں؟؟؟؟ ہوش کے ناخن لیں!

۔۔اور یہ بھی کتنا گناؤنا مذاق ہے کہ ماڈل ٹاؤن کے دہشتگرد دھندناتے پھر رہے ہوں اور انہیں پھانسی دی جا رہی ہو، جو پہلے ہی جیل میں مقید ہیں۔۔۔

یہ بھی کتنا سنگین جرم ہے اس عوام کے ساتھ کہ الطاف حسین جیسا سفاک انسان آزاد ہے اور اسکی تنظیم جو پاکستانی تاریخ کی بدترین دہشت گردی کرنے میں ملوث ہے، اس پر کوئی زبان نہیں کھولتا بلکہ وہ میڈیا کا ڈارلنگ بنا ہوا کہ کوئی خبر اسکی بکواس کے بنا مکمل نہیں ہوتی!!

شہباز شریف کا کہنا ہے کہ طالبان اور ہمارا موقف ایک ہے! فضل الرحمان کا کہنا ہے کہ طالبان کے ساتھ ہمارا دل دھڑکتا ہے اسی طرح کے اور بہت سارے ایسے ناسور ہیں جو طالبان کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ جب دہشگردی کی پشت پناہی کرنے والے اس ملک کی سپید و سیاہ کے مالک ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ طالبان کو پھانسیاں دینے سے ملک میں امن ہو جائے گا؟

ماڈل ٹاؤن کے شہدا چیخ چیخ کر اپنے قاتلوں کی پھانسی کی اپیل کر رہے ہیں!

شہباز شریف کو پھانسی پر لٹکایا جائے! خواجہ سعد کو پھانسی پر لٹکایا جائے!

رانا ثنا اللہ کو پھانسی پر لٹکایا جائے!

کراچی میں زندہ جلائے جانے والی لاشیں اپیل کر رہی ہیں کہ الطاف حسین کو پھانسی پر لٹکایا جائے! ایم کیو ایم کو کالعدم تحریک قرار دیا جائے!

اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو جان جائیے کہ نہ ہی تو آپ دہشت گردی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں! راولپنڈی کی قتل و غارت کا کچھ فیصلہ ہوا؟ واہگہ پر 50 سے زیادہ افراد کے قتل کو کوئی فیصلہ ہوا؟ ہزارہ میں قتل و غارت کے مجرموں کو سزا ملی؟ اب بھی 141 معصوم انسانوں کی لاش پر چند دن واویلے کیے جائیں گے۔۔۔ چہروں پر مکروہ اداسی لیکر ٹی وی کیمروں کے سامنے افسوس کیے جائیں گے، کمیٹیاں بنائیں جائیں گی، پتہ نہیں کس کس کو کس کس جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور عوام کو خوش کر دیا جائے گا۔۔۔ اور عوام! یہ منافق عوام! ایک بار پھر جنگل میں پھنس گئی اور ہر کوئی اپنے اپنے شہیدوں کے لیے روتا رہے گا، اس ملک میں ضیا الحق بھی شہید ہے اور بھٹو بھی، یہاں ہر کوئی جنتی ہے، آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچے بھی اور ظلم کرنے والے طالبان بھی۔۔ ہر کوئی شریف ہے، چاہیے نام شریف ہو یا نہ!

مسعود

"مقررہ وقت"

وہ بھاگ رہی تھی اور بس بھاگتی ہی چلی گئی..ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا...لیلیٰ کی آواز پر بھی نہیں...اسے بس ایک ہی فکر تھی کہ کہیں بہت دیر نہ ہو جائے...بھاگتے بھاگتے اسے یہ خیال آیا کہ ایک بار تو لیلیٰ کو دیکھ لوں کہ پھر شاید کبھی نہ دیکھ پاؤں...لیلیٰ اس کی سب سے اچھی دوست مگر اس نام کے سوا وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی...ایک بار اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ ہی لیا مگر لیلیٰ شاید وہاں سے جا چکی تھی یا پھر لوگوں کی بھیڑ میں کہیں کھو گئی تھی تو اسے نظر نہیں آئی...اسے کچھ برا سا لگا...اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا گئی...اس نے جب اوپر دیکھا تو مضبوط جسامت والا ایک آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا

کہاں جا رہی ہو؟؟؟

اپنی امی کے پاس....وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلی گئی ہیں

ابھی نہیں....تم ابھی نہیں جا سکتی...صحیح وقت پر تمھیں خود وہاں بھیج دیا جائے گا

اس کی آنکھ کھلی وہ بری طرح سے گھبرائی ہوئی تھی ...اس کی سانس پھولی ہوئی تھی...یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ واقعی اتنا بھاگی ہو...وہ بنا کچھ سوچے اپنے بستر سے کودی اور دروازے کی طرف لپکی...اس نے دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی .....اتنا اندھیرا.....ایک عجیب سا سناٹا....اس کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے...مگر یہ خوف اس خوف کے سامنے کچھ نہ تھا...وہ اس سب کو نظر انداز کر کے کچھ سوچتے ہوئے تیز مگر گھبرائے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی...کچھ ہی لمحوں میں وہ اپنی امی کے کمرے کے باہر کھڑی تھی ...اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر پھر پیچھے ہٹ گئی کہ کہیں اس کا خوف سچ نہ ہو جائے ...کچھ دیر رکی رہی مگر پھر اس سناٹے میں ایک عجیب سی آواز سن کر وہ ڈر سی گئی ....اس نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی...دوبارہ سے دروازہ بند کر کہ اس نے دروازے پر اپنا منہ رکھ دیا وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی...شاید اس کی

ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی... کچھ دیر وہ ویسے ہی کھڑی رہی بہت ساری سوچیں اس کے ذھن میں گھومنے لگیں... اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھی .... اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا... شاید اللہ کا ذکر یا کوئی دعا..... پتہ نہیں...

وہ آخر پیچھے مڑی اور اس نے دیکھا کہ اس کی امی کا بستر خالی پڑا ہے... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے....

نہیں، نہیں وہ خود کو سمجھانے لگی لیلیٰ نے جو کہا وہ سچ تو نہیں ہو سکتا... میں نہیں مانتی ...بلکل بھی نہیں مانتی.....امی.....امی.....امی....

مگر اس کی ان نداؤں کا جواب تھا صرف وہ خاموشی... بہت ہی گہری خاموشی ...کچھ بے ھنگم سے خیالات اس کے ذھن میں آنے لگے ...ان کو اپنے ذھن سے جھٹکتے ہوئے وہ پھر سے اپنی امی کو آوازیں دینے لگی.... کہ اچانک اسے وہ آدمی یاد آ گیا ...وہ مضبوط جامت والا... بڑی بڑی مونچھیں.... شعلے اگلتی آنکھیں... گرجدار آواز.... تم ابھی نہیں جا سکتی.... ابھی وقت نہیں آیا تمہارا.... جب صحیح وقت آئے گا تم کو خود راستہ نظر آ جائے گا اپنی امی کے پاس جانے کا

وقت.... لیلیٰ بھی تو کچھ بتا رہی تھی وقت کے بارے میں ... صحیح وقت.... ہاں.... اس نے بھی تو کہا تھا کہ ہر ایک کے جانے کا صحیح وقت مقرر ہے ... اس کے آگے پیچھے کوئی چاہے تو جا نہیں سکتا اور نہ چاہے تو رک نہیں سکتا.....

مگر لیلیٰ کو یہ سب کیسے پتہ چلا..... وہ سوچنے لگی.... ہاں شاید جب اس کے ابّو چلے گئے تھے تب وہ بھی ان کے پیچھے بھاگی تھی تبھی شاید اس آدمی نے اس کو بھی بتایا ہو گا یہ سب

وہ اپنی امی کو بھول کر ان سوچوں میں گم ہو چکی تھی کہ اچانک تیز ہوا سے کھڑکی کھلی اور اس کی آواز سے وہ واپس اس اندھیر اور خاموش کمرے میں لوٹ آئی تھی..... اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کی اور واپس آ کر اپنی امی کے بستر پر بیٹھ گئی...

بستر بلکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور ٹھنڈا ہوتا بھی کیوں نہیں....آخر اتنا عرصہ جو بیت چکا تھا.....لیکن اتنے عرصے میں کسی نے اس کو یہ بات نہ سمجھائی تھی ....جو آج لیلیٰ اور اس آدمی نے سمجھائی...اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا وہ خوف حقیقت میں بدل چکا ہے....

یہ اپنی امی کو اتنا زیادہ پیار کرتی تھی مگر مقررہ وقت اس کی محبّت سے کہیں زیادہ طاقتور تھا....اس کی امی کو لے کر چلا گیا...اور یہ کچھ نہ کر سکی...کوئی کچھ نہیں کر سکتا....یہی قدرت کا نظام ہے...

یہ سب سمجھنے کے بعد اس نے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر لائیٹ اون کی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اپنے عکس سے کہنے لگی...ہر ایک کے جانے کا وقت مقرر ہے سو وہ اپنے وقت پر چلے گئے اور تمھیں اپنے وقت پر جانا ہے سو جب تک یہاں رہنا ہے اندھیرے میں نہیں اُجالے میں رہنا ہے...کیونکہ یہ زندگی اللہ کی نعمت ہے...اسے جانے والوں کے ساتھ ضایع نہیں کرنا....ہاں....تمھیں اُن سے بہت پیار ہے بلکل ہے...تو اپنے پیار کا اظہار آنسوؤں سے نہیں بلکہ اُن کے لئے دعا سے کرو.....

یا اللہ تمام جانے والوں کی مغفرت فرما اور ان کو اپنے اپنی رحمت کے سائے میں رکھ.....آمین.....

بھٹکتی روح (رانیا)

"اغوا"

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ اغوا ہو چکے ہیں؟
اور اپنا تاوان بھی ادا کر رہے ہیں؟
اگر نہیں تو آج میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیسے اغوا ہوئے۔۔۔
آپ کو یہ سُن کر یقیناً حیرت ہو گی کہ آپ اپنی مرضی سے اغوا ہوئے ہیں اور اپنی خوشی سے بہت بھاری تاوان بھی ادا کر رہے ہیں۔ جی ہاں! وہ شیطان ہے جس نے آپ کو آپ کی مرضی سے اغوا کیا ہے اور اب آپ اُسے تاوان میں وہ انمول چیز ادا کر رہے ہیں جس کی قیمت میں دنیا بھر کے خزانے کم پڑھ جائیں۔
شیطان کا انسان کو اغوا کرنے کا طریقہ بھی عجیب ہے وہ ایک دم سے کسی کو اغوا نہیں کرتا بلکہ پہلے وہ انسان کو ورغلاتا ہے، اُسے دنیا کی فانی لذّتوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتا ہے انسان کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اغوا ہونے جا رہا ہے۔ اور پھر جب انسان تھوڑا سا بہک جاتا ہے تو شیطان اُسے اپنی طرف لے جانے والا گناہوں سے بھرا راستہ دِکھاتا ہے اور انسان کی عقل دیکھیئے کہ وہ اندھیرا نظر آنے کے باوجود اُس راستے پہ چل پڑتا ہے اور آخر خود کو شیطان کے ہاتھوں اغوا کرا لیتا ہے اور اس کے بعد شیطان تاوان میں وہ کچھ وصول کرتا ہے جس کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ شیطان کا پہلا وار انسان کے نفس پہ ہوتا ہے اور انسان اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ تاوان میں ایمان کی وہ دولت لٹانا شروع کر دیتا ہے جس کے آگے دنیا بھر کے خزانے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ پہلے قرآن اور نماز چھوڑ کر انسان دنیا کی بے ہودہ رنگینیوں کے لیے وقت کی بربادی حاصل کرتا ہے اور اللہ کی یاد سے غافل ہو کر ہر وقت فحش باتوں اور حرکتوں پہ

قہقے لگاتا ہے، پھر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر رشوت، بد دیانتی اور چوری جیسی آفتوں سے اپنے دِل کے اُجالے پر شیطانی اندھیرا پھیلا کر اُسے فنا کرتا ہے اور آخر انسان بد اخلاقی کی اُس پستی میں جا گِرتا ہے جہاں سے اوپر روشنی کی معمولی سی کِرن کا نظر آنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

کسی دور میں عورت کو شرم وحیا کا پیکر سمجھا جاتا تھا، لیکن وہ عورت ہی ہے جو شیطان کا سب سے مہلک ہتھیار بھی ہے۔ آج کے دور میں تو عورت مرد سے بھی زیادہ خوشی سے خود کو شیطان کے ہاتھوں اغوا کرانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ شیطان پہلے تو عورت سے اُس کی نسوانیت کی چادر چھین لیتا ہے اور پھر اُس برہنہ شو پیس کو گناہوں کے اندھیرے راستے پہ کھڑا کر دیتا ہے اور پھر مرد اُس راستے کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شیطان ہمیشہ یہی ہتھیار استعمال کرے، کبھی مرد کے اندر کی شیطانیت اُس پہ حاوی ہو جاتی ہے اور وہ خود شیطانی راستوں پہ چل پڑتا ہے۔ کبھی جسم کی ہوس، تو کبھی دولت کی چکاچوند، کبھی نفس کی خواہش، تو کبھی شُہرت کی پیاس، اور نہ جانے کن کن راستوں پہ شیطان انسان کو اغوا کرنے کے لیے کھڑا ہے۔

اس کے علاوہ بھی شیطان کے انسان کو اغوا کرنے کے بہت سے طریقے ہیں کہ جن پہ شائد پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔۔۔

آج سوچیئے کہ کیا واقعی آپ اغوا ہو چکے ہیں یا نہیں؟ اور شیطان کی اس قید سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ جواب صرف یہی ہے ''قرآن''

فیصل شبیر

"وقت"

پتہ نہیں مجھے کیوں ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ وقت ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے، اس کو ہم اپنی آسانی کیلئے تقسیم کر دیتے ہیں، جبکہ وقت اپنی جگہ پہ رکا رہتا ہے۔ ہم ہی بچپن سے جوان، اور جوان سے بوڑھے ہوتے ہوئے ایک دن اس دنیائے فانی سے کُوچ کر جاتے ہیں اور وقت اپنی جگہ چٹان بنا ہمیں دیکھتا رہتا ہے۔ دنیا ایک سٹیج کی طرح وقت کے سامنے ہے اور وہ یہاں مختلف ڈرامے خاموشی سے دیکھ رہا ہے۔ جانتا ہے کہ اِنکا تماشہ ختم ہوگا تو نئے لوگ انکی جگہ لے لیں گے۔
دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ وقت کی نبض نہیں تھمتیں، ہم اس سے کچھ بھی تقاضا کریں وہ ہمارے بس میں نہیں، ہم اسکے بس میں ہیں۔ ہم سے پہلے کتنے لوگ آئے، کتنے چلے گئے اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری و ساری رہے گا، لیکن وقت اپنی جگہ اس طرح ڈٹا کھڑا ہے اور یہ تغیر و تبدّل دیکھ رہا ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے
گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک

حیا

"نظر"

نظر کا براہ راست تعلق آنکھ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ہمارے یہاں اتنے بڑے بڑے فنکار بھی پڑے ہیں جو دل و دماغ سے بھی دیکھ لیتے ہیں نظر کو اچھی اور بری سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے یہ شفقت کی بھی ہوتی ہے اور محبت کی بھی کبھی کبھی یہ لگ بھی جاتی ہے تو کبھی کھا بھی جاتی ہے مختصر یہ کہ اس قسم کی باتیں نظر کے حوالے سے سننے میں آتی رہتی ہیں اسکا استعمال بھی مختلف طرحہ سے ہوتا کچھ اسے براہ راست استعمال کرتے ہیں تو کچھ ترچھی کچھ جھجک کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تو کچھ چوری چوری

لیکن

میں آج یہاں جس نظر کا ذکر کر رہا ہوں وہ ہے بدنظر اسکا تعلق آنکھ سے نہیں دیکھنے والے سے ہوتا ہے جس کے پیچھے بری سوچ اور نیت کارفرما ہوتی ہے اور خواتین اسکا شکار ہوتی ہیں اور روزانہ ہوتی ہیں اور کسی کو اس کا احساس یا خیال تک نہیں ہوتا کوئی اس کرب، تکلیف اور دکھ کو نہ ہی محسوس کرتا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے جس سے یہ خواتین روزانہ گزرتی ہیں روزانہ جھلتی ہیں ان بری نظروں اور بدنظروں کو خاص کر وہ خواتین جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر تلاش معاش کی وجہ سے گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور ہوتی ہیں اور شرم کا مقام ہے اسکول کالجز کی بچیاں تک اس بد نظری سے محفوظ نہیں ہر گلی ہر کونے ہر بس اسٹاپ پر بسوں میں سڑک پر گزرتے ہوئے یہاں تک کہ آفسز تک میں غرض ہر طرف وہ لوگ موجود ہیں جو اس قبیح جرم میں مشغول ہوتے ہیں اس میں اچھی بری فیملی یا کسی کے تعلم یافتہ ہونے نا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس میں سب ہی شامل ہوتے ہیں میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں کیا جب وہ کسی اور کی بہن بیٹی پر بری نظر ڈالتے ہیں تو اپنی بہن بیٹیاں یاد نہیں آتیں کیوں کسی لڑکی یا خاتون کو دیکھ کر نظر جھک نہیں جاتی کیا اگر ہمارا ان سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تو وہ احترام کے قابل نہیں ایک شاعر کا شعر نظر سے گزرا لیکن لگتا ہے کہ شاید ہم اتنا گر گئے ہیں کہ اب ہمیں کوئی بھی بات اثر نہیں کرتی

بدنظر اٹھنے ہی والی تھی کسی کی جانب
اپنی بیٹی کا خیال آیا تو دل کانپ گیا

مگر دل تو جب کانپے گا نا جب اپنی بیٹی کا خیال آئے گا جب دوسرے کی بیٹی کو اپنی بیٹی اور دوسرے کی بہن کو اپنی بہن سمجھیں گے اور اس سب کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ نا صرف بدنظری کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں باتیں بھی کرتے ہیں جو کوئی اتنی خوش کن اور اچھی نہیں ہوتیں جنکا میں یہاں ذکر کروں نا جانے ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے،

جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذاء دیں بغیر کسی جرم کے جو ان سے سرزد ہوا ہو، وہ (بڑے ہی) بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں (□ (سورۃ الاٗحزاب . آیت 58)

لیکن نہیں.............. یہ کبھی نہیں سدھریں گے کہ انکا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمارا احساس ہی مر چکا ہے ہم بے حس ہو چکے ہیں ہم بھول جاتے ہیں کہ ہماری بہن بیٹیاں بھی گھر سے باہر نکلتی ہیں ان کے لئے بھی لوگوں کی نظریں ایسی ہی ہوتی ہونگی ان کے بارے میں بھی لوگ باتیں کرتے ہوں گے لیکن ہم..................... یہ سب نہیں سوچتے ہمیں تو صرف اپنی ذہنی عیاشی سے غرض ہے اس سے کسی کی زندگی جہنم بنتی ہے تو بنا کرے........... کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو ہمیں کیا........... میرا سوال ہے ہر اس فرد سے جو اس بدنظری کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں کے جو باتیں اور جملے وہ ان خواتین کے لئے بولتے ہیں جو نجانے کتنی بار سوچ کرنا چاہتے ہوئے بھی گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور ہوتی ہیں کہ قدم قدم پر ہر موڑ پر حوس کے ناگ پھن پھیلائے بیٹھے ہیں مگر........... وہ پھر بھی گھر سے باہر نکلتی ہیں کہ

کیوں؟.....کیونکہ کوئی نا کوئی مجبوری ہی انھیں باہر نکلنے پر مجبور کرتی ہے ورنہ شاید ہی کوئی عورت ہو جو اس کرب اور اذیت سے روزانہ گذرنا پسند کرے یہ گھنٹوں اسٹاپ پر کھڑی رہتی ہیں لیکن انہیں گاڑیوں میں سوار ہونے کے لئے اپنے کمپارٹمنٹ میں بیٹھنے کے لئے بھی جگہ میسر نہیں آتی کہ خود کو فخر کے ساتھ مرد کہنے والے بری شان کے ساتھ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں براجمان ہوتے ہیں کسی عزت دار کے منہ سے یہ نہیں نکلتا کہ بھی کم از کم لیڈیز سیٹ تو خالی کردو ڈرائیور اور کنڈکٹر حضرات کی تو بات ہی کیا کی جائے،

تو یہ ہیں میری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جن سے قوموں کی عزت ہوتی ہے جو ہماری آن ہوتی ہیں جنکی عزت کی خاطر باپ بھائی جان دے دیا کرتے ہیں اور.....یہ ہے ہمارا سلوک جو ہم ان سے روا رکھتے ہیں سچ اور عزت کے منہ پر ایک طمانچہ ہمارا ایک ایسا رویہ جو ہر انسان کا اصل چہرہ بے نقاب کردیتا ہے مگر ہم اپنے اس اصل سے نظریں چراتے ہیں کہ وہ اتنا مکروہ ہو چکا ہے کے ہم خود بھی شناخت نہیں کرپاتے کے یہ ہم ہی ہیں.....میرا دل خوں کے آنسو روتا ہے ہم کب سمجھیں گے کب وہ وقت آے گا جب ہمارے گھر کی خواتین بنا کسی خوف کے گھروں سے نکل سکیں گی.....کب وہ وقت آے گا جب ہم نظریں جھکا کر چلنا سیکھیں گے کہ اسکا مجھے حکم ہے.....ہوسکتا ہے بہت سے لوگ میری اس سوچ اور بات سے اختلاف کریں انھیں اسکا حق بھی ہے لیکن میں کسی دوسرے کو مورد الزام ٹھہراوں اس سے یہ بہتر نہیں کہ میں خود کو بہتر بناؤں کہ بلآخر میرے اعمال کا جواب مجھے ہی دینا ہے

اللہ ہم سب کو ہدایت کی دولت سے نوازے
آمین

سیّد سُہیل اختر

”یہ عشق نہیں آساں “

یہ عشق نہیں آساں۔۔

ہم کہاں اور ہمارا عشق کا دعویٰ کہاں۔ شاید محترم مہر علی شاہ گولڑوی نے اپنے نام کو شامل کرتے ہوئے میرے بارے میں ہی کہا تھا کہ:۔

کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

کیونکہ ہم عشق عشق کرنے والے ہر وہ کام کرتے ہیں جو ہمارے نبی پاک، محبوبِ خدا، احمد مجتبیٰ، حضرت محمد ﷺ کی سنتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ ہمیں خوشی محسوس ہوتی ہے جب ہم کسی کا دل توڑتے ہیں، کسی کو کسی قسم کی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ جب ہم کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہیں یعنی غیبت کا پنڈورا بکس کھول لیتے ہیں۔ اور جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ پر کوئی انگلی بھی اٹھانے کی جرات کرتا ہے تو ہم کفن باندھ کر نکل پڑتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں: گستاخِ رسول کی ایک ہی سزا، سر تن سے جدا سر تن سے جدا۔ عشقِ رسول ﷺ میں موت بھی قبول ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن کیا یہ نعرے لگانے سے پہلے، اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرنے سے پہلے کوئی تیاری بھی کی ہوتی ہے، اپنے آپ کو ان گناہوں سے، ان منافقتوں سے پاک کیا ہوتا ہے جس اسی رسول ﷺ کی ہر سنت کی خلاف ورزی کر کے کمائی ہوتی ہیں۔ ہم نعرے تو لگاتے ہیں لیکن کیا یہ سوچا ہوتا ہے کہ وہ نبی ﷺ ہماری اس ادا کو آسانی سے قبول کر پائیں گے؟ بے شک دلوں کے حال اللہ جانتا ہے لیکن ظاہری پاکی بھی تو ضروری ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اللہ کے احکامات کو جتنا آسانی سے ممکن ہو اپنی زندگی کا حصہ بناتے ہوئے اسکے محبوب نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش تو کریں۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں، باقی توفیق دینے والی اللہ کی پاک ذات ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ویسے تو نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر منحوس انگلی اٹھانے کا کام انکی زندگی میں ہی شروع ہوگیا تھا لیکن اس وقت وہ خود اس عمل کے خلاف اپنے عاشقین صحابہ کو حکم دے دیتے تھے۔ اور پھر انکے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی یہ لعنتی کام کم نہیں ہوا، بلکہ بڑھتا چلا گیا۔ موجودہ گستاخانہ کام کا سلسلہ ڈنمارک کے ایک ملعون اخبار جیلنڈ پوسٹن میں 30 ستمبر 2005 کو گستاخانہ خاکے شائع کرنے کے آغاز سے ہوا۔ تب سے اب تک ہر سال، ہر ماہ یہ گستاخانِ نبی ﷺ ایسی اوچھی حرکتوں پر اتر آئے ہیں۔ ڈنمارک کی پیروی میں اور بہت سے کفار ملکوں میں یہ کفریہ حرکت دہرائی گئی۔

یہ کام کبھی بھی مزید ترقی نہ کرتا اگر ہم مسلمان ایک ہو کر اس ملعون و گستاخ فعل کے خلاف آواز اٹھاتے ، انکے خلاف مضبوط محاذ قائم کرتے ، اپنے الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم اپنے دل کی صدا، اپنے عشق کو تمام دنیا پر ظاہر کرتے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم اگر مؤثر طریقے سے اپنا کردار ادا کرتی اور ان کفار ممالک پر واضح کر دیتی کہ اگر دوبارہ یہ غلطی، صریح غلطی دہرائی گئی تو پھر کسی قسم کی محاذ آرائی کا ذمہ دار وہ کافر ملک ہوگا نہ کہ کوئی مسلمان ملک، جس نے اللہ اور اسکے رسول کے حکم پر عمل کرتے ہوئے انکے خلاف جارحانہ قدم اٹھایا ہوگا۔ لیکن صد افسوس، یہ تنظیم کچھ بھی نہ کر سکی۔ بس قراردادیں پاس کرنے پر قائم رہی، اور زیادہ سے زیادہ ان ممالک کو بتا دیا کہ یہ کام غلط ہے۔ اس تنظیم سے اگر اور کچھ نہیں تو یہ تو ہو سکتا تھا کہ اپنے ممبر ممالک پر قانون نافذ کرتی کہ ان غیر ممالک (کافر ممالک) سے ہر قسم کی تجارت بند کر دیں۔ نہ ان کو کوئی چیز برآمد کریں نہ ان سے درآمد کریں۔ انکا معاشی بائیکاٹ کریں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کفار ممالک کو سمجھ آجاتی۔ کیونکہ وہ ممالک جانتے ہیں کہ انکے ہاں بنی ہوئی اشیاء کی زیادہ مانگ مسلمان ممالک میں ہی ہے۔ لیکن کچھ بھی نہ ہو سکا۔ نہ او۔ آئی۔ سی کچھ کر سکی نہ مسلمان کچھ کر سکے۔

جب کچھ بھی نہ ہوتا تو ان کافروں کا حوصلہ مزید بڑھا۔ مزید ممالک میں گستاخانہ خاکے شائع ہوئے۔ فیس بک پر مقابلے کرانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ پھر مختلف عیسائی پوپ بلکہ پاپ سے بھرپور عیسائی مذہبی لیڈروں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ اور کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچتے ہی رہے۔ ہم مسلمان تب بھی خاموش رہے۔ اور خاموش تماشائی کی طرح احتجاج کرتے رہے۔ ان احتجاجوں سے کیا ہوتا ہے، اپنے ملک میں جلسے جلوس نکالنے سے کیا حل نکلتا ہے، اپنے وطن کی اشیاء توڑنے سے، چیزیں جلانے دشمنانِ اسلام کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟ کچھ نہیں، سب کچھ اپنا ہوتا ہے، تو نقصان بھی اپنے کو ہی ہوتا ہے۔

اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی جب ہم چپ رہے تو ان بت پرستوں نے اب حد ہی کر دی۔ یعنی ہمارے پیارے، اللہ کے راج دلارے نبی ﷺ پر ایک عدد گستاخانہ فلم تک بنا ڈالی۔ میں تو اس حق میں بھی نہیں ہوں کہ کسی بھی نبی کے بارے میں کوئی فلم نما چیز تخلیق کی جائے چہ جائیکہ کہ ہمارے پیارے نبی کی شان میں یہ گستاخی کی جائے۔ نتیجہ تو صاف ظاہر ہے مسلمان ملکوں میں جو اشتعال پھیلا اور اسکے نتیجے میں جو کچھ ہوا وہ بہت کم ہے۔ لیبیا میں امریکہ کا سفیر مارا گیا، یمن میں امریکی سفارتخانے کو نقصان پہنچا، دوسرے ممالک میں کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ پاکستان میں جناب غلام احمد بلور نے اس گستاخ فلم پروڈیوسر کا سر قلم کرنے والے کے لیے ایک لاکھ ڈالر کا انعام بھی رکھ دیا۔ خدا کی شان۔ میں ذاتی طور پر انکو اور انکی پارٹی کو جو کچھ بھی سمجھتا تھا، لیکن یہ بات درست ہے اور شاید بہت سے مسلمان لوگ میری بات کی تائید بھی کریں گے کہ محترم غلام احمد بلور نے زندگی میں جتنے بھی گناہ اگر کیے ہوں گے وہ اس ایک اعلان پر بخش دیے گئے ہوں گے۔

ہم نے اس دن جلسے کیے، جلوس نکالے، اپنے ہی وطن کی اشیاء کو نقصان پہنچایا، املاک جلائیں، گاڑیوں کو نقصان پہنچایا۔ سوال یہ ہے کہ جنکی املاک کو نقصان پہنچایا گیا، جن کی گاڑیاں تباہ کی گئیں، کیا وہ اس فلم پروڈیوسر کے ساتھ تھے؟

نہیں، انھیں تو علم بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ تو خود مہنگائی، بدامنی کے ہاتھوں ڈسے ہوئے تھے۔ اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نقصان پہنچانے والے محب وطن پاکستانی تھے، یا عاشقِ رسول ﷺ تھے؟ نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ نہ تو یہ محب وطن پاکستانی تھے، نہ عاشقِ رسول تھے۔ بلکہ یہ لوگ وطن دشمن کے ہاتھوں کھلونا تھے۔ جن کو پیسے دے کر اس بات پر راضی کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ہم وطنوں کا، اپنے ملک کی املاک کا نقصان کریں۔ کیونکہ عاشق رسول ﷺ تو اپنی پوری زندگی کو انکی سنتوں پر عمل کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور انکے حکم کے مطابق تو وہ ایک کانٹا تک کسی کو نہیں چبھنے دیتا تو کہاں وہ اپنے وطن کو نقصان پہنچانے کا سوچے گا۔

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

کہنا صرف یہ ہے کہ عشق عشق کا نعرہ لگانے والو، پہلے اپنے گریبان میں جھانکو۔ کیا اپنے محب کی کسی بات پر عمل بھی کرتے ہو، یا مدینہ کے منافقوں کی طرح بظاہر اسلام ہی لائے ہوئے ہو۔ کیونکہ بقول اقبال۔۔

ہو زباں پہ کلمہ لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ نہیں

پرنس ٹائیگر

"جمع تفریق ضرب تقسیم"

صاحب کہتے ہیں کہ اہلِ یونان نے علمِ فلکیات وعلمِ ریاضی میں کسی زمانے میں وہ عروج حاصل کیا تھا جو شاید اب تک موجود ہوتا تو یہ انسان خدائی دعویٰ ٹھوک بجا کے کر رہا ہوتا، ہر شخص اپنے آپ ایک خدا ہوتا، اپنے علم اور حثیت کا خدا اپنے رتبے وپہنچ کا خدا ہوتا۔ جب ہر ایک ہی خدا ہوتا تو بندہِ خدا کون ہوتا؟۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اہلِ یونان نے اس قدر ترقی کی کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان پر ہونے والے فیصلوں اور تبدیلیوں کی پیش گائیاں بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ کرنے لگے۔ اور جب کوئی قوم اتنی ترقی کر لے کہ نظامِ قدرت پر اثر انداز ہونے لگے یا مداخلت کرنے لگے تو اس کے خاتمہ کے لیے آسمانی فیصلے ہوا کرتے ہیں ۔اور وہی ہوا۔ اللہ رب العزت نے اس قوم کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ فرمایا اور اس کے لیے (فرشتہ) حضرت عزرائیل علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام جب وہاں پہنچے تو ان کی ملاقات ایک کمسن چرواہا سے ہوئی۔ انہوں نے اس چرواہے سے پوچھا کہ بتاؤ عزرائیل علیہ السلام اس وقت کہاں ہیں؟ بچے نے اپنی چھڑی جس سے وہ بکریوں کو ہانکتا تھا زمین پر ایک زائچہ بنایا اور زمین پر کچھ جمع تفریق ضرب تقسیم شروع کی ۔اور پھر کہنے لگا کہ میں نے حساب کیا جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عزرائیل علیہ السلام اس وقت نہ تو آسمانوں میں کہیں ہے اور نہ ہی زمین پر کہیں اور موجود ہے۔ عزرائیل علیہ السلام یہیں کہیں ہے یا تو تم عزرائیل علیہ السلام ہو یا پھر میں ہوں۔ اور ہو یا پھر میں ہوں۔ اور میں عزرائیل علیہ السلام ہو نہیں سکتا۔۔ اس کا مطلب ہے تمہی عزائیل علیہ السلام ہو

تو اللہ رب العزت نے عزائیل علیہ السلام کو دکھایا کہ دیکھو اب اس قوم کا مزید زندہ رہنا مناسب نہیں ہے کہ جب ایک گڈریا ایک چرواہا اتنا آگے اپنے علم میں پہنچ چکا ہے تو اس قوم کے دانا و سمجھدار لوگ کس مام پر کھڑے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ یہ خدائی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانی شروع کر دیں ان کی چھٹی کر دینی چاہیے۔ لہذا ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ سوال ذہن میں پیدا ہو گا کہ ایسا کیوں؟ جب باری تعالی خود غور و فکر کرنے کی تلقین فرماتا ہے تو پھر کیوں ایک ایسی قوم کو ختم فرما دیا جو علم کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی کار، قدرت کے راز و حکمتوں تک کو جاننے کی استعداد حاصل کر چکی تھی۔ تو اس کے لیے یوں مثال لیجیے بلکہ تجربہ کیجیے اور اپنے کسی بڑے کی تحقیق شروع کیجیے۔ تجسس میں پڑ جاہیے۔ جاسوسی شروع کر دیجیے۔ مثلاً۔ آپ کے بھائی یا والد ہیں ان کی جاسوسی کرنی شروع کر دیجیے۔ وہ کہاں جاتے ہیں کیا کرتے ہیں کتنا کماتے ہیں۔ کسے دیتے ہیں کتنا دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر دیکھیے آپ کی کیسی درگت بنتی ہے۔ آپ سے یہی کہا جائے گا جس کام سے آپ کا تعلق نہیں ہے اس میں مداخلت مت کیجیے۔ اور اگر آپ باوجود تنبیہ کے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو سرزش و سزا کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ اور بات پھر بھی نہ سنبھلی تو گھر سے نکال باہر کیے جائیں گے۔ اس بات کو آپ تک پہنچانے کا مقصد یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیاری یا سیانا پن کسی کو بھی پسند نہیں ہے۔ جب انسان اسے ناپسند کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اللہ عزوجل کے معاملات میں مداخلت کرے۔ اب چلتے ہیں اس بات کی جانب جس کے لیے مجھے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنی پڑی۔ قومِ یونان تو علم و تحقیق کے ساتھ جستجو کی راہیں ہموار کرتی ہوئی حدود کو پار کر گئی۔ مگر کوئی قوم اگر بیٹھے بیٹھے کسی کے بارے میں اندازے قائم کرنے لگ جائے بلا تحقیق خود سے نتائج اخذ کرنے لگ جائے۔ اور پھر خود بخود روٹھ جائے ناراض ہو جائے۔ من گھڑت باتیں نہ صرف خود سوچے بلکہ دوسروں کے بھی کان بھرے۔ اور متنفر کرے تو بتاہیے معاشرے میں امن کی فضائیں کیسے پیدا ہوں گی۔۔ ایسا تو نہیں کہ ہم ان لوگوں میں شامل ہیں جو خود سے کسی کے بارے میں

کرتے رہتے ہیں۔ بعض بدگمانیاں گناہ میں شامل ہو کر انسان کو دوسروں سے الگ تھلگ کر دیتی ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جب تم کسی مسلمان بھائی کو کسی عیب میں مبتلا دیکھو تو خود کو سمجھاؤ کہ اسے کوئی مشکل پریشانی لاحق ہے جس کی وجہ سے وہ ایسے عیب میں مبتلا ہے اور یوں عذر تلاش کرتے ہوئے خود کو 07 بار سمجھاؤ کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ کوئی اور وجہ ہے 07 عذر تلاش کرو خود کو روکو، کسی بدگمانی میں مبتلا مت ہونے دو۔ مگر ہم تو پہلی بار ہی بدگمان ہو کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بناتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم شیطان کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے خود کو اس کا مددگار ثابت کرنے کا ثبوت دیتے ہیں۔۔ ہمیں اپنا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ خرابی ہمارے اپنے اندر کا موسم خراب ہوتا ہے تو ہمیں باہر کے سارے موسم بُرے لگنے لگتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ہمارے منہ کا زائقہ خراب ہوتا ہے ہماری اپنی کسی اندر کی خرابی کی وجہ سے تو ہم خوش زائقہ ولزیز چیزوں سے منہ موڑ لیتے ہیں ہمیں ہر چیز بدمزہ لگنے لگتی ہے۔ اور ہم اسے دیکھنا تک گوارہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں تو خود کو ٹھیک کرنے کی اشد ضرورت ہے چہ جائیکہ دوسروں پر اعتراض کریں اور دوسروں کو بھی اس مہم میں شامل کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ آیئے آج سے ہم اپنی شخصیت کو تراش کر سنوار کر اس طرح اس دنیا سے جائیں کہ ہمارا استقبال آسمان والے کریں۔ اور کہیں کہ دیکھو ایک انسان اپنے دیے گئے وقت کو صحیح استعمال کرتے ہوئے کامیاب وکامران لوٹ رہا ہے۔ آیئے کہ اپنے اندر کے انسان کی تعمیر کریں اس سے پہلے کہ موت اپنے شکنجے میں جکڑ کر ہمیں اسی حال میں دنیا میں لے جائے کہ سوائے کفِ افسوس وندامت کے ہمارے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ آیئے کہ ہم اپنے دلوں میں دوسروں کے لیے جگہ بنائیں۔ ان کی کوتاہیوں اور عیوب کو درگزر کریں اور اس معاشرے میں امن وآشتی پھیلانے والوں کی صف می شامل ہو جائی۔ آیئے ہم اپنے جمع تفریق ضرب تقسیم کا رخ صحیح کریں کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم خود سے کسی کے بارے میں غلط جمع کر کے اسے خود سے تفریق کر کے اور بدگمانی کی ضرب دے کر اپنے اردگرد تقسیم کر رہے ہیں۔ طالبِ نظر طالبِ دعا

اسماعیل اعجاز (خیال)

”حق تلفی“

ناصرہ بیگم کے لیے آج کا دن بہت اہم تھا۔ آج انکے بیٹے عاصم کا نتیجہ نکلنے والا تھا، وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہیں تھیں۔ انہیں صبر آتا بھی تو کس طرح ۔۔۔۔۔۔۔ عاصم کے ساتھ ساتھ انکا بھی تو رزلٹ تھا۔ سولہ سالا تعلیم کا اختتام اب کچھ وقت میں ختم ہوا چاہتا تھا۔ انہیں ایسا لگا کہ کٹھن مشکلوں اور پریشانیوں کا دور اب کچھ وقتوں کا مہمان ہے۔ گزرا وقت انکی آنکھوں میں گھومنے لگا۔

انکے شوہر طارق ایک نجی بنک میں ملازم تھے۔ زرقِ حلال سے بیوی بچے کی پرورش کرنا انکی اولین ترجیح تھی۔ مگر زندگی نے ان سے وفا نہیں کی، دورانِ ملازمت ہارٹ فیل ہونے سے ان کی موت واقع ہوگئی ناصرہ بیگم سات سالا عاصم کے ہمراہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئیں۔ شوہر کے آفس سے انشورنس کا کچھ پیسہ ملا تو گھر میں ایک چھوٹی دوکان کھول لی اسطرح گزر بسر ہونے لگی۔ بیٹے کی تعلیم پوری کرنے کی لگن میں زندگی گزارنے لگیں۔ ذہانت تو باپ سے عاصم کو ورثے میں ملی تھی پرائمری سے مڈل ۔۔۔ مڈل سے میٹرک، انٹر پھر گریجویشن اور ماسٹر تک میں اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آج صبح سے وہ اپنے رزلٹ کے انتظار میں غائب تھا۔ نماز پڑھ کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، دعا ختم کرکے چہرے پر ہاتھ پھیرے سامنے عاصم کو آتے دیکھا اسکے چہرے سے دمکتی خوشی سے اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ناصرہ بیگم نے کہا کہ آج ہمارے لیے خوشی کا دن ہے میں سارے محلے میں میٹھائی بانٹوں گی۔

اچھا امی! جیسے آپ کی مرضی، بس اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں نوکری تلاش کرسکوں اور آپ کا سہارا بنوں ۔۔۔۔

ضرور بیٹا ۔۔۔

اللہ تم کو کامیاب کرے۔

کچھ دن گزرے عاصم نے نوکری کی تلاش شروع کردی۔ ایک جگہ انٹرویو کے لیے اسکو بلایا گیا۔ وہ وقت مقررہ پر پہنچ گیا اور بھی دوسرے امیدوار وہاں موجود تھے وہ انکے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگا ان سب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سب کہیں نہ کہیں ملازمت کر رہے تھے۔ اس سے جس نے پوچھا اس نے کہا کہ میں نے ابھی تعلیم مکمل کی ہے پہلے کہیں اور نوکری نہیں کی۔ ایک کے بعد ایک لوگ انٹرویو دے کر جاتے رہے آخر میں اسکا نمبر آیا وہ اندر پہنچا اندر دو افراد موجود تھے ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا بیٹا اکیڈمک ایجوکیشن کے علاوہ اور بھی کوئی ٹیکنیکل ڈگری ہے؟ عاصم نے جواب دیا نہیں سر ابھی تو تعلیم سے فارغ ہوا ہوں نوکری ملنے کے بعد کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے۔ ابھی میرے معاشی حالات مجھے اسکی اجازت نہیں دیتے۔

مگر ہمیں تو ایسا آدمی چاہیئے جو تجربے کار ہو اور کچھ ٹیکنیکل نالج بھی رکھتا ہو جس سے ہم ایک سے زیادہ کام لے سکیں۔۔۔۔ عاصم حیران ہوا۔۔۔۔۔۔ لیکن سر آپ نے یہ بات پہلے آپنے اشتہار میں واضع نہیں کی تھی۔۔۔۔۔۔

تو کیا ہوا، یہ تو ایک عام سی بات ہے میرا ادارہ ایسے لوگوں کی خدمات چاہتا ہے جو ایک سے زیادہ کام کر سکیں۔۔۔۔۔

سر میں بھی ایک سے زیادہ کام کرنے کا اہل ہوں بس آپ مجھے ایک موقع دیں

۔۔۔۔۔۔

لیکن ابھی تو تم ناتجربے کار ہو تمہیں تو ایک کام کو کرنے کے لیے کچھ وقت لگے گا اور دوسرا تو بعد کی بات ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہے تم کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرو اس سے تم کو تجربہ ملے گا اور کچھ عرصے بعد اچھی نوکری حاصل کر سکو گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

عاصم افسردہ سا گھر واپس آیا ماں کو اپنی روداد سنائی ناصرہ بیگم نے اسکو تسلی دی اور کہا کہ ابھی تو شروعات ہے آگے بہتر ہوگا۔

وقت گزرتا رہا اور عاصم ناتجربے کاری کے طعنے سن سن کر اپنی کوششوں میں لگا رہا کبھی اسکولیبر کے ساتھ کام کرنے کی آفر ہوتی تو کبھی بغیر تنخواہ تجربہ لینے اور سب سے حیرت انگیز بات وہ ہوئی تھی کہ میاں ہمکو تو اے لیول، او لیول تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے اور کچھ نہ ہوا کوئی سفارشی اس نوکری کو لے اڑتا وہ حیران سا رہ جاتا ہے۔ آخر اسکی تعلیم اِس دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی لیے ناکافی کیوں ہے سولہ سالا بہترین تعلیمی کارگزاری دِکھانے والا عملی میدان میں ہر جگہ فیل ۔۔۔۔۔۔ اسکو ماں کی محنت کا احساس بھی تھا جو نہ صرف آج بھی زندگی کی ضروریات پوری کرنے میں مصروف عمل تھی بلکہ اسکے لیے ایک شجر سایہ دار کی مانند تھی جو زمانے کی دھوپ میں اسکو بے لوث سایہ فراہم کرتی۔ تین سال اس ناکامی میں گزارنے کے بعد جس انڈسٹریل ایریا میں عاصم نوکری کی تلاش میں جاتا تھا آج اب وہاں ٹھیلے پر بریانی فروخت کرتا ہے اسکے ٹھیلے پر بہت واضع لکھا ہے ماسٹر بریانی جہاں وہ نوکری کی تلاش اور ذریعہ معاش کے لیے آنے والوں کا ایمانداری سے پیٹ بھرتا ہے۔

یہ تھی عاصم کی کہانی، بلا شبہ عاصم نے جو راہ اپنائی وہ نہ صرف رزق حلال ہے بلکہ محنت میں عظمت ہے پر صادق آتی ہے لیکن ہر نوجوان عاصم نہیں ہوتا جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر صبر کرلے یہ سوچنے کی بات ہے ہمارے اس ترقی یافتہ معاشرے پر نظر ڈالی جائے تو نوجوانوں کی اکثریت اس گھمبیر مسئلے سے دوچار ہے اس احساس محرومی اور ناانصافی نے کتنے نوجوانوں کو بحالت مجبوری ایسی راہیں اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہے کہ جن کو اپنا کر وہ خود کی تخلیقی صلاحیتوں کو مطلوبہ جگہ استعمال کرنے سے قاصر ہیں اور جسکی وجہ سے ان کے اندر منفی سوچ جنم لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی باصلاحیت نوجوان اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں ہمارے ادارے کسی کو سکھانے کے روادار نہیں ہیں ۔۔۔۔۔ تجربہ جب حاصل ہوتا ہے جب کسی کام کو باقائدہ انجام دیا جانے لگے اگر کرنے کو کوئی کام نہیں تو کوئی ایسا نوجوان جو اپنی تعلیم کا اختتام کرچکا ہو کسی فیلڈ کو کیسے جوائن کرے اور ایک عفریت جوان پر سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے وہ ہے مہنگائی۔

وہ سب سوچ کر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ کب تک یوں ہی بیٹھ کر کھاتا رہوں گا کب تک ابو یونہی کماتے رہیں گئے۔

آج کے اس پر آشوب دور میں ہمارے نوجوانوں کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے کہ اپنے کیریر کو شروع کرنے کے لیے وہ بھلے ہی نہ تجربے کار سہی لیکن قابل ضرور ہیں ۔میری رائے میں انکو ضرور مواقع ملنے چاہیے اور اس کا صحیح طریقہ کار رائج کیے جانے چاہیے جیسے کالجز اور یونیورسٹی کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے لائق اور قابل طالب علموں کو اپنے طور پر سرکاری، نیم سرکاری اداروں میں اچھے نجی اداروں میں ریکومنڈ کرے اور اسکو آنر کیا جائے یا ہر ریجن میں ایک ایسچینج قائم ہو جو خود ٹیسٹ لے کر ان نوجوانوں کو اپنے پاس رجسٹرڈ کرے اور متعلقہ اداروں میں ان کی رسائی اور قیام کو ممکن بنائے تا کہ ہمارے یہ قابل اور باصلاحیت نوجوان در در بھٹکنے سے بچ جائیں اور مایوسی اور نا امیدی کی سیاہی ان کے روشن مستقبل کو تاریکی میں نہ لے جائے ہمارا یہ بیش قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہو اور متوسط طبقے میں تعلیم کی تقسیم کا خوف پیدا نہ ہو اور وہ اپنے بچوں کے لیے اسے وقت کا زیاں سمجھنے لگ جائیں۔۔۔۔۔ہمیں موجودہ دور کے نوجوانوں اور ہر لیول پر تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرنی ہوگی تا کہ ہمارے آگے آنے والے وقت میں۔ہم اپنے ملک وقوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں

فیصل شیخ

" 35 پنکچر "

جب بات پنکچر لگانے کی تو، کسی پیٹرول پمپ کے پاس شدید گرمی میں بیٹھے ہوئے۔ پسینے سے شرابور، گندے کپڑوں میں ملبوس ایک ایسے انسان کا خیال آتا ہے۔ جو ملکی حالات سے بے خبر، گاڑیوں اور موٹر سائیکلون کے ٹائیر کھولتا اور پنکچر لگاتا نظر آتا ہے۔ ہمارے گھر کے قریب بھی ایک ایسا ہی پنکچر لگانے والا اپنی دوکان کھولے بیٹھا عزت کی روزی کماتا نظر آتا ہے۔

چند دن قبل مجھے بھی پنکچر لگوانے کا اتفاق ہوا، میری موٹر سائیکل پنکچر ہوگئی تھی۔ ہم بھی پہنچے، اپنی موٹر سائیکل گھسیٹتے ہوئے، تو حیرت کی انتہاء نہ رہی، کہ دوکان کا نقشہ ہی بدلہ ہوا تھا، جب دوکان کے قریب پہنچے تو ہمیں دیکھتے ہی ایک صاحب نے جو سفید کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ ایک بچے کو آواز دی۔۔۔ اوے نوازے باؤ جی توں گڈی چاء۔۔۔ اور ایک نیلے رنگ کی ڈانگری پہنے لڑکا میری طرف لپکا۔۔۔۔۔ اور میرے ہاتھ سے موٹر سائیکل پکڑ لی۔۔۔۔۔ اتنئ دیر میں ایک آواز اور آئی۔۔۔۔۔ باؤ جی اینڈر آجاؤ،، چھائں وچ۔۔۔۔۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا، جہاں پانچ، چھ بڑی آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں، اور دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے تھے، اور سامنے وہ بیٹھا تھا۔ جب قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ سفید کاٹن کے سوٹ میں جو شخص ہے، دراصل وہی پنکچر والا ہے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ نوازے فٹافٹ جا، باؤ جی واسطے ٹھنڈا پانی تے چاء لے کے آ۔۔۔ شاوا میرا پتر۔۔

میں نے بیٹھتے ہوئے۔۔ پوچھا بھائی اسحاق خیر تو ہے۔۔۔ ماشاءاللہ بڑی ترقی کرلی ہے۔

وہ قہقہ مار کے ہنساء۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہان جی باؤ جی۔۔۔ بس جی۔۔۔ ترقی ہم نے کیا کرنی ہے، ترقی تو ہمارے بڑوں نے کی ہے۔۔۔

میں سمجھا نہیں۔۔۔۔ کیا مطلب ہے۔ تمھارا۔۔؟

کچھ دن گزرے عاصم نے نوکری کی تلاش شروع کردی۔ ایک جگہ انٹرویو کے لیے اسکو بلایا گیا۔ وہ وقت مقررہ پر پہنچ گیا اور بھی دوسرے امیدوار وہاں موجود تھے وہ انکے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگا ان سب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سب کہیں نہ کہیں ملازمت کر رہے تھے۔ اس سے جس نے پوچھا اس نے کہا کہ میں نے ابھی تعلیم مکمل کی ہے پہلے کہیں اور نوکری نہیں کی۔ ایک کے بعد ایک لوگ انٹرویو دے کر جاتے رہے آخر میں اسکا نمبر آیا وہ اندر پہنچا اندر دو افراد موجود تھے ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا بیٹا اکیڈمک ایجوکیشن کے علاوہ اور بھی کوئی ٹیکنیکل ڈگری ہے؟ عاصم نے جواب دیا نہیں سر ابھی تو تعلیم سے فارغ ہوا ہوں نوکری ملنے کے بعد کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے۔ ابھی میرے معاشی حالات مجھے اسکی اجازت نہیں دیتے۔

مگر ہمیں تو ایسا آدمی چاہئے جو تجربے کار ہو اور کچھ ٹیکنیکل نالج بھی رکھتا ہو جس سے ہم ایک سے زیادہ کام لے سکیں۔۔۔۔ عاصم حیران ہوا۔۔۔۔۔۔ لیکن سر آپ نے یہ بات پہلے آپنے اشتہار میں واضع نہیں کی تھی۔۔۔۔۔۔

تو کیا ہوا، یہ تو ایک عام سی بات ہے میرا ادارہ ایسے لوگوں کی خدمات چاہتا ہے جو ایک سے زیادہ کام کر سکیں۔۔۔۔۔

سر میں بھی ایک سے زیادہ کام کرنے کا اہل ہوں بس آپ مجھے ایک موقع دیں ۔۔۔۔۔۔

لیکن ابھی تو تم ناتجربے کار ہو تمہیں تو ایک کام کو کرنے کے لیے کچھ وقت لگے گا اور دوسرا تو بعد کی بات ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہے تم کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرو اس سے تم کو تجربہ ملے گا اور کچھ عرصے بعد اچھی نوکری حاصل کر سکو گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

عاصم افردہ سا گھر واپس آیا ماں کو اپنی روداد سنائی ناصرہ بیگم نے اسکو تسلی دی اور کہا کہ ابھی تو شروعات ہے آگے بہتر ہوگا۔

وقت گزرتا رہا اور عاصم ناتجربے کاری کے طعنے سن سن کر اپنی کوششوں میں لگا رہا کبھی اسکو لیبر کے ساتھ کام کرنے کی آفر ہوتی تو کبھی بغیر تنخواہ تجربہ لینے اور سب سے حیرت انگیز بات وہ ہوئی تھی کہ میاں ہمکو تو اے لیول، او لیول تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے اور کچھ نہ ہوا کوئی سفارشی اس نوکری کو لے اڑتا وہ حیران سا رہ جاتا ہے۔ آخر اسکی تعلیم اِس دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی لیے ناکافی کیوں ہے سولہ سالا بہترین تعلیمی کارگزاری دِکھانے والا عملی میدان میں ہر جگہ فیل ۔۔۔۔۔۔ اسکو ماں کی محنت کا احساس بھی تھا جو نہ صرف آج بھی زندگی کی ضروریات پوری کرنے میں مصروف عمل تھی بلکہ اسکے لیے ایک شجر سایہ دار کی مانند تھی جو زمانے کی دھوپ میں اسکو بے لوث سایہ فراہم کرتی۔ تین سال اس ناکامی میں گزارنے کے بعد جس انڈسٹریل ایریا میں عاصم نوکری کی تلاش میں جاتا تھا آج اب وہاں ٹھیلے پر بریانی فروخت کرتا ہے اسکے ٹھیلے پر بہت واضع لکھا ہے ماسٹر بریانی جہاں وہ نوکری کی تلاش اور ذریعہ معاش کے لیے آنے والوں کا ایمانداری سے پیٹ بھرتا ہے۔

یہ تھی عاصم کی کہانی، بلا شبہ عاصم نے جو راہ اپنائی وہ نہ صرف رزق حلال ہے بلکہ محنت میں عظمت ہے پر صادق آتی ہے لیکن ہر نوجوان عاصم نہیں ہوتا جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر صبر کر لے یہ سوچنے کی بات ہے ہمارے اس ترقی یافتہ معاشرے پر نظر ڈالی جائے تو نوجوانوں کی اکثریت اس گھمبیر مسئلے سے دوچار ہے اس احساس محرومی اور ناانصافی نے کتنے نوجوانوں کو بحالت مجبوری ایسی راہیں اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ جن کو اپنا کر وہ خود کی تخلیقی صلاحیتوں کو مطلوبہ جگہ استعمال کرنے سے قاصر ہیں اور جسکی وجہ سے ان کے اندر منفی سوچ جنم لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کئی باصلاحیت نوجوان اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں ہمارے ادارے کسی کو سکھانے کے روادار نہیں ہیں ۔۔۔۔۔ تجربہ جب حاصل ہوتا ہے جب کسی کام کو باقائدہ انجام دیا جانے لگے اگر کرنے کو کوئی کام نہیں تو کوئی ایسا نوجوان جو اپنی تعلیم کا اختتام کر چکا ہو کسی فیلڈ کو کیسے جوائن کرے اور ایک عفریت جوان پر سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے وہ ہے مہنگائی۔

میں نے چابی آٹھائی۔۔۔موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔۔۔اور چل دیا۔۔۔اسکی ایک ایک بات میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی۔۔واقعی۔۔۔۔ 35 پنکچرون ۔۔۔والی ٹیوب کی حکومت کیسے چل پائے گی۔۔۔اور کیا اسی طرح پرانی ٹیوب والی حکومت میں ہم بار بار ہوا بھرتے رہینگے۔۔۔۔۔یا پھر حکومت کی گاڑی چلانے کے لئے نئی ٹیوب ضروری ہے۔۔۔ اسے تبدیل ہونا چاہیئے۔۔۔کب تک ایسے چلے گا۔۔۔۔

میں نے اپنی موٹر سائیکل کارخ بازار کی طرف کر دیا۔۔۔اور ایک نئی ٹیوب لیکر کر بیگ میں رکھ لی، شام کو پہلا کام واپسی پر یہی کرونگا۔۔۔۔گاڑی میں نئی ٹیوب ڈلوا دونگا۔۔۔بار بار کی جھک جھک سے جان چھٹ جائے گی۔۔۔۔۔

اب آپ سوچین کہ کیا کرنا ہے۔۔۔۔ 35 پنکچر والی ٹیوب پر ہی گزارا کرنا ہے۔۔۔ یا پھر اس بار نئی ٹیوب ڈلوائینگے۔۔۔ اس بارے میں سوچین۔۔۔۔ ابھی کافی وقت ہے۔۔۔۔یا وقت نہیں ہے۔۔۔۔اور میں بھی سوچتا ہوں۔

فاروق سعید قُریشی

"بحق سرور کائنات رحمتہ العلالمین"

تاریخ کے وسیع دائروں پر نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں کہیں مصلحین دکھائی دیتے ہیں۔ شریں مقال واعظ اور آتش بیان خطیب سامنے آتے ہیں۔ بہت سے فلسفہ طراز ہر دور میں ملتے ہیں۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کے انبوہ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کی۔ جنگجو فاتحین کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ جماعتیں بنانے والے اور تمدن میں مدوجزر پیدا کرنے والوں سے بھی تعارف ہوتا ہے انقلابی طاقتیں نگاہوں میں آتی ہیں جنہوں نے نقشہ حیات کو بار بار زیروزبر کیا۔۔ رنگارنگ مذاہب کی نیوڈالنے والے بکثرت سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کے داعی بھی اسٹیج پر آئے کتنے ہی مقنن ایوان تہذیب میں جولہ گرہ چکے ہیں۔

لیکن جب ہم ان کی تعلیمات، کارناموں اور ان کے پیدا کردہ مجموعی نتائج کو دیکھتے ہیں تو اگر کہیں خیروفلاح دکھائی دیتی ہے تو وہ جزئی قسم کی ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے ایک گوشے پر ابھرتے ہیں پھر خیروفلاح کے ساتھ طرح طرح کے مفاسد ترکیب دکھائی دیتے ہیں

لیکن سرور کائنات کہ دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل دیا اور صبغتہ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لیکر بازار تک مدرسے سے لیکر عدالت تک اور گھروں سے میدان جنگ تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے خیالات بدل گئے نگاہ کا زاویہ بدل گیا عادات واطوار بدل گئے

رسم ورواج بدل گئے، حقوق وفرائض کی تقسیمیں بدل گئیں، خیروشر کے معیارات اور حرام وحلال کے پیمانے بدل گئے اخلاقی قدریں بدل گئیں دستور اور قانون بدل گئے اس پوری کی پوری تبدیلی میں جس کا دائرہ ہمہ گیر تھا ایک سے دوسرے سرے تک خیروفلاح کے علاوہ کچھ نہیں ملتا کسی گوشے میں شر نہیں ملتا کسی کونے میں کوئی فساد نہیں کسی جان بگاڑ نہیں ہر طرف تعمیر ہی تعمیر ہے

اورا رتقا ہی ارتقا۔۔درحقیقت محسن انسانیت کے ہاتھوں انسانی زندگی کو نشاۃ الثانیہ حاصل ہوئی۔اپ نے ایک نظام حق کی صبح درخشاں سے مطلع تہذیب کو روشن کر کے بین الاقوامی دور تاریخ کا افتتاح فرمایا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

حضور نہ تو فلسفی تھے کہ محض چند اونچے اور گہرے خیالات دیتے اور واقعاتی احوال سے تعرض نہ کرتے اور نہ ایک واعظ تھے جو اجتماعی فساد سے آنکھیں بند کر کے محض فرد کو مخاطب بناتے اور ٹھنڈے اور میٹھے واعظ سنایا کرتے اور نتائج پہ سرے سے سوچا ہی نہ کرتے انسانیت کے اس محسن نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیات انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ان قوتوں کو پہچانا جو نظام حیات پر حاوی تھیں حضور نے چونکہ ایک مکمل دین برپا کرنے کے لیے تحریک برپا کی تھی اس لیے آپ نے ایک ایک کر کے سلیم الفطرت افراد کو تلاش کیا پھر جس کے سینے میں کلمہ حق کی شمع روشن ہوگئی اسے ایک تنظیم میں پرو دیا اس کی تربیت کی اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا اور اسے جاہلی نظام کے خلاف معرکہ آرا کیا جو لوگ اپ کے گرد اکھٹے ہوئے اپ نے انہیں صوفی یا درویش نہیں بنایا راہبوں اور جوگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا، بدی سے بھاگنے اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت واقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت نہیں دی۔وہ لوگ بھولے بھالے اور معذورانہ شان کے زہاد نہیں تھے۔وہ جری بے باک، باشعور، زیرک، بصیرت مند، غیرت مند، متحرک اور فعال تھے وہ پادریوں اور سادھوں کے سے انداز نہیں رکھتے تھے بلکہ کارفرما بننے کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے

بدقسمتی سے اپ صلی علیہ والہ وسلم کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا کہ اج اپ کی دعوت حق اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہے حضور پورا دین لائے تھے حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے اس تحریک کو چلانے کے لے بہترین قائیدانہ صلاحیتوں اور اعلی درجہ کے جس سیاسی شعور کی ضروت تھی اپ کی ہستی اس سے مالا مال تھی اپ صلی علیہ واسلم نے جو انقلاب برپا کیا اس کی روح تشدد نہیں محبت خیر خواہی کی روح تھی۔حضور انسانیت کے لیے حد درجہ رحمدل تھے اور ابنائے ادم کی ساتھ اپ کو سچا پیار تھا۔

ذرا اس حیقت پہ غور کیجئے گا کہ وہ ہستی اتنا عظیم انقلاب لاتی ہے مگر تشدد اور غلو سے کام لینے کی کوئی ایک مثال نہیں ملتی اپ نے س ارا دار ومدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا کسی پر دھونس نہیں جمائی، کبھی رعونت نہیں دکھائی کبھی انسانیت کی تحقیر نہیں کی اکڑفوں سے کام نہیں لیا بلکہ دوسروں کی جو درحقیقت کمزور اور بے بس تھے رعونتوں کو صبر سے برداشت کیا۔یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کے دل مسخر ہو جاتے ساتھ انے والے دیدہ و دل فراش راہ کرتے مخالفت کرنے وای اپنے اپ کو پست اور ذلیل محسوس کرتے۔پھر جب حضور کی صداقت وشرافت کے اگے سر جھکا دیتے تو ان میں ایسی تبدیلی اتی گویا کایا پلٹ ہوگئی

حضور کا انقلابی کلمہ حق جس دل میں اترا جس زندگی مین داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا۔۔

ڈاکٹر فاسوٹس

"ہر خواہش پر دم نکلے"۔

تیس سال کی ایماندارانہ نوکری کے بعد صادق صاحب ریٹائر زندگی گزار رہے تھے۔ اس پورے عرصے میں انھوں نے عزت کمائی تھی اور عزت سے زندگی گزاری تھی۔ کبھی کسی کو جرات نہیں ہوئی تھی کہ انکے کام پر یا انکی ذات پر انگلی تک اٹھا سکے۔ اور انھوں نے اپنی اولاد کو بھی اسی ایمانداری کا سبق پڑھایا تھا۔ یہ نیک اولاد انکی زندگی کا ثمر تھی۔ انکے خاندان والے بھی صادق صاحب کی زندگی اور انکی اولاد کی مثالیں دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اتنا کرم رکھا تھا کہ ساری زندگی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ اس ذات پاک نے ہمیشہ انکی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا تھا۔ جب نوکری اس مرحلہ پر پہنچی کہ پورے ماہ کے اخراجات کے بعد کچھ تھوڑا بہت بچا سکیں تو ان کو خواہش ہوئی کہ اپنی چھت تان سکیں۔ یہ سوچتے ہوئے انھوں نے رقم پس انداز کرنا شروع کر دی۔ کیونکہ جتنا عرصہ وہ نوکری کرتے رہے، کرائے کے گھر میں رہے۔ حتیٰ کہ ریٹائر ہوئے تو بھی گھر کرائے کا ہی تھا۔ ہر پانچ دس سال بعد مکان تبدیل کرتے۔ کبھی ایک وجہ ہوتی تو کبھی کوئی دوسری۔

اللہ نے صادق صاحب پانچ بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ نہ صرف بڑا بیٹا جمال شادی کی عمر کو پہنچ چکا تھا بلکہ بیٹی کی عمر بھی بیاہنے لائق تھی۔ بیٹے کی شادی کرنے سے اسلیے کترا رہے تھے کہ کرائے کے گھر میں بہو کو لانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اوپر سے بیٹا بھی ایسا کہ شادی کی فکر ہی نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ غلط کاموں میں ملوث تھا۔ بلکہ اس نے کبھی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ صبح نوکری پر جانا، شام کو کوئی گیم کھیلنا یا پھر چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر گپ شپ کرنا، رات کو سوتے تک کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنا جو کہ درحقیقت اسکا مشغلہ تھا۔ بس یہ لگا بندھا وقت کا ایک دھارا تھا، جس کے ساتھ جمال بہتا رہتا تھا۔

صادق صاحب نے ایک دن اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ اپنی نیک سیرت بیوی سے اصلاح لی اور نتیجہ بیٹے کی شادی کی صورت میں نکلا۔ کبھی کبھی کسی گھر کو کوئی خوشی راس نہیں آتی۔ صادق صاحب کے گھر بھی برسوں بعد یہ خوشی آئی تھی۔ جب شادی کی تقریبات جاری تھیں تو کسی نے پوچھا کہ وہ بہت اترا اترا کر چل رہے ہیں تو صادق صاحب نے انتہائی عاجزی سے جواب دیا کہ یہ اترانا اصل میں اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ آج اس ذات پاک نے اس قابل بنایا کہ وہ بھی اپنے بیٹے کی شادی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا خرچہ کرنے کے قابل ہوں گے۔ تو بس اللہ کا شکر مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ خیر ابھی اس خوشی کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ انکے دوسرے بیٹے شہزاد سے ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ اور اسکے دفتر کے کچھ ساتھی کرائے کی گاڑی لیکر دفتر کے کسی کام سے دوسرے شہر گئے تھے۔ واپسی پر کوئی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ بارش کی وجہ سے پھلن روڈ پر گاڑی پھسل کر روڈ کے کنارے پر پلی کی رکاوٹ کو توڑتے ہوئے کوئی بیس فٹ کی گہرائی میں جا گری۔ گاڑی کو تو نقصان پہنچا ہی تھا لیکن گاڑی کے اندر موجود شہزاد کے دو دوست موقع پر ہی فوت ہو گئے جب کہ ایک کی ٹانگ فریکچر ہو گئی۔ شہزاد گاڑی چلا رہا تھا۔ بظاہر تو اسے کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی بس ہلکی ہلکی خراشیں آئی تھیں لیکن اندرونی طور پر کافی دباؤ آیا تھا۔ پولیس موقع پر پہنچی متوفیوں اور زخمیوں کو گاڑی سے نکالا اور انھیں تھانے کے ساتھ ہی بنے ہوئے ہسپتال پہنچایا۔

گاڑی چونکہ شہزاد نے کرایہ پر لی تھی تو گاڑی کے مالک نے گاڑی کا سارا ہرجانہ شہزاد پر ڈال دیا۔ جو کہ کوئی اڑھائی لاکھ کے قریب تھا۔ کیونکہ انجن تک کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ جبکہ صرف شہزاد والی سائیڈ چھت سے نہیں چپکی تھی باقی ساری چھت گویا فرش سے لگ گئی تھی۔ دروازے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ مکینک نے یہ کم از کم خرچہ بتایا تھا۔ صادق صاحب کے لیے یہ ایک شدید جھٹکا تھا۔

کیونکہ انکا پروگرام یہ تھا کہ جمال کی شادی کے بعد جو رقم بچی تھی وہ اور کبھی بھلے وقتوں میں تھوڑی تھوڑی رقم بچا کر شہر میں ایک پلاٹ لیا تھا، اسکو بیچ کر اپنے آبائی شہر میں کوئی سستا سا پلاٹ خرید کر اس پر ایک دو تین کمروں کا ایک کچا پکا مکان تعمیر کر دیں گے۔ لیکن اللہ کی حکمتیں وہ ہی جانے۔ ایک تو گاڑی والوں کا دعویٰ دوسرا پولیس نے بھی اپنی طرف سے وفات پانے والوں کو مدعی بنا کر شہزاد کے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ تیز اور لاپرواہ ڈرائیونگ سے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ضمانت پر شہزاد کو رہائی تو مل گئی تھی لیکن ہر ہفتے یا دوسرے ہفتے مقدمے کی پیروی کے لیے جانا پڑتا۔ اگر مقدمہ اپنے شہر میں ہوتا تو کم از کم آنے جانے کا خرچہ تو نہ ہوتا۔ لیکن شہر دوسرا تھا۔ وکیل کو بھی ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ تو اسکی خاطر کرائے کی گاڑی بکنگ پر لائی جاتی۔ صادق صاحب کی ذہنی تکلیف میں اس وقت مزید اضافہ ہوتا جب انکی واپسی پر یہ پتہ چلتا کہ آج جج چھٹی پر تھا یا وکیل استغاثہ نہیں تھا، جسکی وجہ سے مزید ایک تاریخ پڑ جاتی۔

وقت گزرتا گیا، دن ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ لیکن پاکستان میں شاید ہی کسی مقدمے کا فیصلہ دنوں یا ہفتوں میں ہوا ہوگا۔ سو شہزاد کی قسمت میں بھی کچہری کے دھکے کھانے ابھی باقی تھے۔ صادق صاحب کی مکان بنانے کی خواہش دل میں ہی رہی۔ کیونکہ گاڑی والے روزانہ گھر کے دروازے پر آ کھڑے ہوتے۔ آخر ایک جرگہ نے فیصلہ کیا، اور فیصلہ کے مطابق صادق صاحب کو اپنے خون پسینے کی کمائی کی ایک خطیر رقم گاڑی والے کو دینی پڑی۔ پھر مقدمے کی پیروی میں آنے جانے کا خرچہ، وکیل کا خرچہ الگ سے ہوتا تھا۔ تو گویا ساری جمع پونجی ہاتھ کا میل ثابت ہو رہی تھی۔ اپنی خون پسینے کے کمائی کو یوں بغیر کسی وجہ کے لٹتا دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہے اور زندگی کو روگ لگا بیٹھے۔ یہ روگ پھیپھڑوں کے کینسر میں بدل گیا۔

بہتیرا علاج کرایا، لیکن کینسر تو ہزار پا کی طرح جب جکڑ لیتا ہے تو جان لیکر ہی جان چھوڑتا ہے، سو یہ حال انکے ساتھ بھی ہوا۔ شاید ہزاروں میں کوئی ایک آدھ اگر زندگی کی بازی جیت جائے تو جیتے، ورنہ تو سارے ہی ہار جاتے ہیں۔ ادھر شہزاد کا مقدمہ جاری تھا ادھر صادق صاحب صاحب فراش ہو گئے تھے۔ ایک دن انکے ایک رشتہ دار انکی تیمارداری کرنے آئے۔ باتوں باتوں میں شہزاد کے مقدمے کا پوچھا۔ جب سنا کہ ابھی تک چل رہا ہے تو بہت افسردہ ہوئے۔ کہا کہ انکا ایک جاننے والا ایڈیشنل سول جج ہے وہ اس سے بات کریں گے۔ بے شک سارے کام اللہ کی مرضی سے اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔ وہ رشتہ دار وسیلہ بنے اور انکے کہنے پر ایڈیشنل سول جج نے مداخلت کی اور اس یک طرفہ مقدمے کا فیصلہ کچھ یوں ہوا کہ اسے داخل دفتر کر دیا گیا۔ صادق صاحب نے یہ سنا تو سکون کا سانس لیا کہ کوئی مسلہ تو حل ہوا۔ لیکن یہ سکون کا سانس بھی صرف اس حد تک تھا کہ زندگی کی جو چند گھڑیاں رہ گئی ہیں سکون سے تو گزریں گی۔ کیونکہ انھیں اپنی بیماری کا علم تھا۔ اور یہ بھی علم تھا یہ پھیپھڑوں کا سرطان کس سطح پر ہے۔ اگر چہ انکے بیٹوں نے بلکہ ہر کسی نے ان کو اپنی طرف سے لاعلم رکھا تھا لیکن جس طرح بارش خدا کی رحمت ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی بندوں کی نظر میں زحمت بن جاتی ہے، اسطرح انکا علم، تجربہ اور تعلیم بھی انکے بیٹوں کی نظر میں اس موقع پر زحمت بن گئی تھی۔ کہ جس چیز کو وہ ان سے چھپاتے وہ خود اپنی بیگم سے کہہ کر ڈاکٹرز کی رپورٹ منگوا کر پڑھتے۔ اگر چہ بچوں نے والدہ سے درخواست کی ہوئی تھی کہ اگر انکے والد کبھی اس قسم کے کاغذات طلب کریں تو کہہ دیں کہ وہ بچوں نے کہیں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن انکی بیگم اللہ کے حکم کے مطابق صادق صاحب کو واقعی میں اپنا مجازی خدا سمجھتی تھیں۔ تو انکے حکم کو کیسے ٹال سکتی تھیں۔ صادق صاحب پڑھتے اور پھر مسکرا دیتے۔

صادق صاحب کو اللہ نے بہت بڑا دل عطا کیا تھا۔ زندگی میں کبھی کوئی پریشانی آئی تو اسکو دل و دماغ پر سوار نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے اسکا حل طلب کیا اور حل کے لیے دنیاوی طور پر بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ انکا کہنا تھا کہ کسی بھی پریشانی اگر ذہن پر سوار کرو گے تو زندگی کا زوال شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ پھر اس

پریشانی کا حل نکالنے کے لیے وہ کوششیں نہیں ہوں گی جو دل لگا کر کرنی چاہیے تھیں۔ اور واقعی انھوں نے یہ بات سولہ آنے سچ کہی۔ کیونکہ آج جب بھی جمال کو کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو وہ شاید ایک لمحہ کے لیے پریشان ہوتا ہو تو ہو، ہمیشہ اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہیں نکلا تو اس مسئلے کو ہی ختم کر دیا۔

صادق صاحب کے سرطان کا علم انکے خاندان والوں کو انکی وفات سے صرف چھ ماہ پہلے ہوا تھا۔ اور جب علم ہوا تو یہ سرطان تیسرے سٹیج کو ختم کر کے چوتھے اور آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن آفرین ہے ان پر کہ زندگی کے صرف آخری بیس، پچیس دن بستر پر گزارے، اور شاید صرف پانچ دن ایسے تھے جن میں انکو کچھ کھلانے پلانے میں مدد کرنا پڑی تھی۔ کیونکہ سرطان ایسا موذی مرض ہے کہ اندر ہی اندر سے پورے جسم کو گھلا دیتا ہے۔ باہر سے اگرچہ انسان صحت مند نظر آتا ہے، لیکن آخری دنوں میں پتہ چلتا ہے کہ مریض تو اب ہلنے جلنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں صادق صاحب کی دو خواہشیں اور سامنے آئیں۔ ایک تو انکا کوئی پوتا پوتی ہوتے جنھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، اپنے ہاتھوں سے اسے چھوتے، کچھ دن ہی سہی کم از کم اپنی گود میں کھلاتے۔ یہ خواہش اسلئے تھی کہ جمال کی شادی کو چار سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا تھا لیکن اللہ نے ابھی انکے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلایا تھا۔ اور پھر ایک اور خواہش جو انھوں نے کی کہ انکی اکلوتی بیٹی کی شادی انکی زندگی میں ہی ہو جائے۔ یہ نہ صرف انکی خواہش تھی بلکہ دو تین دفعہ تو انھوں نے اصرار بھی کیا۔ اگرچہ وہ بستر مرگ پر تھے لیکن پھر بھی اپنے گھر میں ڈھولک کی تھاپ پر ایک دفعہ بابل کے گیت سننا چاہتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ انھوں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ تو صادق صاحب بھی یہ تینوں خواہشیں کہ اپنا گھر، پوتا/ پوتی اور بیٹی کی شادی، اپنے سینے میں دفن لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ رمضان المبارک کا ماہ مقدس شروع ہو چکا تھا۔ اللہ کی راہ میں سحری اور افطاری آباد ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تیسرے روزے کی تیاریاں کی جا رہی تھی۔ کسی گھر میں پراٹھے پک رہے تھے تو کسی گھر میں انڈوں کا آملیٹ بنایا جا رہا

ادھر صادق صاحب کے گھر میں سحری کی تیاری ہو رہی تھی اور ادھر وہ ہسپتال میں ایک بیڈ پر بڑے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ انکے تین جوان بیٹے بے بسی کی حالت میں انکے ارد گرد کھڑے انکی اکھڑتی سانسوں کو سن رہے تھے اور بدن کے جھٹکے دیکھ رہے تھے۔ جس جس بیٹے کو قرآن پاک کی جو جو سورتیں یاد تھیں وہ انکا ورد کر رہا تھا۔ اور پھر انھوں نے ایک آخری ہچکی لی اور اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ کے کاموں میں کوئی بھی چاہے کوئی نبی ہو یا ولی ہو، کوئی بھی مداخلت نہیں کر سکتا۔ صادق صاحب کی تینوں خواہشیں تب پوری ہوئیں جب وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ اور انکی وفات کے ایک سال کے اندر اندر پوری ہوئیں۔ جمال اور بھائیوں نے بہت دھوم دھام سے اپنی اکلوی بہن کی رخصتی کی۔ وقت رخصت اگر نہیں رویا تو آسمان نہیں رویا ورنہ وہاں موجود کوئی فرد ایسا نہ تھا جسکے آنسوں نہ بہے ہوں۔ کوئی ہچکیوں سے نہ رویا ہو۔ کہ آج سب کو صادق صاحب کی یاد آرہی تھی۔ انکی بیٹی کو رخصت کرنے کی خواہش سے سارے واقف تھے۔ اسی سال انھوں نے اپنے گھر کی تعمیر شروع کی۔ جس پلاٹ پر گھر کی بنیاد رکھی وہ پلاٹ صادق صاحب نے اپنی وفات سے کوئی ایک سال پہلے شہزاد پر کیے گئے خرچے سے بچی ہوئی رقم سے خریدا تھا۔ اور پھر اسی سال اللہ پاک نے جمال کو ایک خوبصورت بیٹی سے نوازا۔ بچی کے نین نقش ہو بہو ویسے ہی تھے جیسے کہ صادق صاحب کی خواہش تھی۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے

صادق صاحب اس دنیا سے چلے گئے، انکی تینوں بڑی خواہشیں پوری ہوئیں۔ ہر خواہش پوری ہونے پر انکے خاندان والوں نے رشک کا اظہار کیا اور ساتھ میں افسوس کا اظہار بھی۔ لیکن

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ان میں سے کوئی خواہش بھی ناجائز نہیں تھی۔ ساری کی ساری اسلام کے دائرے کے اندر تھیں۔ لیکن اللہ پاک کی حکمتیں تو وہ خود ہی جانے۔ ہم تو اسکے عاجز بندے ہیں۔ جب کسی کی جائز خواہشات پوری نہیں ہو سکتیں، تو ناجائز کے نہ پورے ہونے پر رونا دھونا کیسا۔

ابن نیاز

”آخری الفاظ“

تمہارے آخری لفظ جو میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا
کچھ باتیں کہنا بہت مشکل ہوتی ہیں اب آپ مجھ سے کبھی بات نہیں کرنا

کتنی آسانی سے کہہ دی یہ مشکل بات تم نے؟ پتا نہیں کیسے میں یہ
سب سن کر بھی خاموش رہا کچھ بھی نہیں کہہ سکا

رو رو کے دیواروں سے سر ٹکرانا تھا
گر جان گئی میری مجھے بھی مر جانا تھا

کیسے بھول گئی تم وہ سب وعدے قسمیں مجھے کیوں یقین نہیں آتا
کہ تم چلی گئی ہو میری زندگی سے؟ تم تو جانتی تھیں کہ میرا دل کتنا
ضدی ہے اس کو کیسے سمجھاؤں؟

اے دل سنبھل جا اب یوں ضد نہیں کرتے
نہ منزل تھی تیری وہ نہ تیرا ٹھکانا تھا

جانتی ہو اب بھی میں ہر چودھویں
کی رات کو جاگتا رہتا ہوں کہ شاید تم آجاؤ مگر تم نہیں آتی ہو میں اکیلے ہی
ساری رات چاند سے تمہاری باتیں کرتا رہتا ہوں اور سنو وہ چاند کے ساتھ جو
ستارا ہوتا تھا جسے تم نے میرا نام دیا تھا وہ ستارا اب نظر نہیں آتا شاید میری
طرح وہ بھی ٹوٹ گیا ہے

مجھے چاند میں بھی اس کا چہرہ دکھتا تھا
کیا وقت سنہرا تھا کیا خوب زمانا تھا

آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں تنہا ہوں تمہارے بنا،
تمہاری ایک ایک بات یاد آتی ہے اور مجھے رلا جاتی ہے، کس کو سناؤں
اب میں اپنے دکھ؟ میں مجبوریوں کی چکی میں پس گیا میرا کوئی قصور نہیں تھا
اس میں، یہ طوفان تو اک دن آنا تھا یہ تم بھی جانتی تھی مگر اس کے باوجود بھی
تم چلی گئیں اس طوفان میں چھوڑ کر مجھے

اک آندھی چلی ایسی سب کچھ گنوا آیا
خالی ہاتھ مجھے تنہا لوٹ کے آنا تھا

اور جاتے ہوئے اپنے حصے کی خوشیاں بھی مانگ لیں تم نے، میرے پاس کچھ

تو چھوڑا ہوتا یادوں کے سوا، تم میرے لیے ایک سپنا ہی تو تھیں، یہ جانتے ہوئے بھی کے سپنے حقیقت نہیں ہوتے میں اس کی تعبیر ڈھونڈتا رہا مگر میرے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا، سوائے ان لفظوں کے کہ اب آپ مجھ سے کبھی بات نہیں کرنا

آنچل سے پکڑ کر اسے روک تو لیتا پر
وہ احساس تھا اک انجم کب ہاتھ میں آنا تھا

وصی انجم

جملہ حقوق بنام پیغام ایڈمن محفوظ ہیں
کوئی بھی امیج بغیریر اجازت کاپی کرنا منع ہے

پیغام
seekho aur sikhao

www.pegham.com